RULING IDEAS OF OUR LORD.
BISPOF D'ARCY

تعلیم المسیح

یعنی اناجیل اربعہ کے مطابق خداوند کی تعلیم کے خاص اصول

مصنفہ

رائٹ ریورنڈ ڈاکٹر ڈارسی صاحب
لارڈ بشپ آف کلوہر

مترجمہ

ڈاکٹر آئی۔ یو۔ ناصر
اسسٹنٹ سرجن

کرسچین نالج سوسائٹی۔ انارکلی۔ لاہور۔
سنہ ۱۹۰۶ء
S. P. C. K. LAHORE.
قیمت فی جلد ۶/ بار اول ۱۰۰۰ جلد

RULING IDEAS OF OUR LORD.
BISFOP D'ARCY

تعلیم المسیح

یعنی اناجیل اربعہ کے مطابق خداوند کی تعلیم کے خاص اصول

مصنّفہ

رائٹ ریورنڈ ڈاکٹر ڈارسی صاحب
لارڈ بشپ آف کلوہر

مترجمہ

ڈاکٹر آئی-یو-ناصر
اسسٹنٹ سرجن

کرسچن نالج سوسائٹی-انارکلی-لاہور-

سنہ ۱۹۰۸ء

قیمت فی جلد ۶/ S. P. C. K. LAHORE. بار اول ۱۰۰۰ جلد

فہرست مضامین

رایٹ ریورنڈ ڈاکٹر سی۔ ایف۔ ڈارسی صاحب بشپ آف کلوہر فی زمانہ کلیسیائے آئرلینڈ کے نامی گرامی علما و مصنفین میں سے ہیں۔ اور اُن کی یہ کتاب اس لئے اردو خوان ناظرین کے نذر کی جاتی ہے کہ اس کے مطالعہ کے ذریعے سے اناجیل اربعہ کی تلاوت اُن کے لئے پہلے سے بھی زیادہ فائدہ بخش ہو۔ جناب بشپ صاحب کے دیباچہ کو کچھ بڑھا کر راقم اس تصنیف کی کیفیت و اغراض کے بارہ میں چند باتیں لکھتا ہے*

جو شخص اناجیل اربعہ کو غور و فکر سے پڑھے اُس پر واضح ہوگا کہ اُن میں خداوند یسوع مسیح کی ہدایتیں اور نصیحتیں کسی تعلیمی نظام کے سانچے میں ڈھالی نہیں گئیں۔ بلکہ جس طرح وقتاً فوقتاً اور موقع بہ موقع خداوند نے مختلف شخصوں یا جماعتوں کو نصیحتیں دینا مناسب جانا اُسی طرح وہ اُن صحیفوں میں قلمبند کی گئیں۔ اگر مسیح نے اپنی تعلیمات عقائدنامہ یا دینی مسایل کی شکل میں پیش کی ہوتیں تو ممکن ہے کہ چند عرصہ تک اُس کے پیروؤں کو سہولت ہوتی۔ مگر چونکہ بنی انسان کے حالات اور خیالات اور زبانیں صدیوں کے بعد بہت متغیر اور مُبدّل ہو جاتی ہیں تو اس صورت میں انجیل کے اندر قرآن کی طرح بہت سی ایسی باتیں پائی جاتیں۔ جو

زمانۂ حال کے اعتبار سے صریحاً متروک ہوتیں۔ پس خداوند یسوع مسیح نے اپنی تعلیمات اکثر تمثیلوں۔ نظیروں اور گفتگو کے پیرایہ میں ایسے طور سے پیش کیں کہ اُن کے اصول سادہ لوح آدمی پر بھی بخوبی واضح ہو سکیں اور پھر بھی ہر زمانہ کے حالات اور خیالات پر صادق آسکیں +

کلیسیائے عامہ نے انجیلی تعلیمات کا خلاصہ عقاید ناموں میں قلمبند تو کیا ہے۔ مگر آگے چل کر زمانہ بہ زمانہ ضروریات کے بموجب مومنوں کو اپنے خداوند کی آسمانی روشنی کی شعاعوں کا عکس ذہن اور بیان کے آئینہ میں دکھانا پڑا ہے۔ لہٰذا یہ کتاب بھی ایسے آئینہ کا کام دیتی ہے۔ اس میں مصنّف نے خداوند کی تعلیم کے بڑے بڑے اصول یکے بعد دیگرے انتخاب کر کے ہر ایک کے مختلف پہلوؤں کو روشن کر دیا۔ چنانچہ اُسنے اوّل مسیح کی تعلیم کے اخلاقی اصول چار ابواب میں بیان کئے۔ اور ان میں خدا کی بادشاہت کا خیال متقدم اور بہ تفصیل بیان شدہ ہے۔ دوئم مصنف نے دینی اصول پیش کئے اور وہ بھی چار ابواب میں بیان کئے گئے ہیں جن میں باب سوم "بیٹے کا باب" مفصل اور سب سے پُر مغز ہے۔ یہ نسبتاً کہا جاتا ہے۔ مگر یقین ہے کہ ناظرین بالیقین اس رسالہ کے تمام بیانات سے فائدہ اُٹھائینگے چنانچہ ایسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ نہ صرف پڑھنے والے کی معلومات کو بڑھا دیتی ہے۔ بلکہ اُسکے قواءِ ذہنی کو ایسی متحرک کرتی ہے کہ وہ خود روشنضمیری اور بیدار مغزی کے خیالات پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ مصنف کی ہر ایک رائے کو تسلیم کرے۔ مگر جب انجیل کو پھر مطالعہ کریگا تو آپ ہی خداوند یسوع مسیح کے زندگی بخش کلام کے اعلےٰ اور عمیق معنوں کو زیادہ صفائی سے سمجھیگا اور اپنے میں اُن کی تاثیر محسوس کریگا +

ایچ۔ یو۔ وائیٹ بریخٹ

تعلیمُ المسیح

جس میں ان خیالات کا مختصراً بیان کیا گیا ہے جن پر خداوند مسیح نے اپنی تعلیم میں بہت زور دیا

تمہید

(۱) بڑے آدمیوں کی تین اقسام ۔ بڑے بڑے آدمی تین طریقوں سے دُنیا پر اثر ڈالتے ہیں ۔ اوّل شخصیت اور سیرت سے ۔ دوم اپنے اعمال و افعال سے ۔ سوم ۔ اپنی تعلیم واقوال سے ۔ اوّل قسم کے اشخاص کی مثالیں ۔ ابراہام ۔ سقراط اور ٹامس اے کمپس ہیں ۔ جنہوں نے اپنی شخصیت کے ذریعے دُنیا کو متأثر کیا ۔ ان بزرگوں نے کوئی بڑا بھاری کام کر کے نہ دکھلایا اور نہ کسی خاص قسم کے خیالات کا اظہار کیا ۔ نمایاں کام کرنے والوں کے تذکرات سے صفحات تواریخ بھرے پڑے ہیں ۔ مثلاً داؤد ۔ سکندر اعظم قیصر روم ۔ یا چارلس اعظم ۔ گو بڑے بڑے افعال جلیل القدر طبائع کا ما حصل ہیں ۔ تو بھی ایسی طبائع والے اشخاص نمایاں کام کرنے والوں سے بالکل مختلف ہیں ۔ اس قسم کے لوگوں کی سیرت ہی کے اثر سے دُنیا کو فائدہ پہنچا

ہے۔ تیسری قسم کے بزرگ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دُنیا کو خیالات پیدا
کرنے کی طاقت دی ہے۔ یہی اشخاص بنی آدم کے معلم ہیں۔ بعض اوقات
ایک ہی شخص مندرجہ اقسام کے مختلف شقوں میں شامل ہوتا ہے۔ بہت
سے بڑے بڑے معلموں اور کارِ نمایاں کرنے والوں نے دُنیا کو اپنی سیرت سے
بھی متأثر کیا۔ اسی درجہ میں بعض اس قسم کے نام پائے جاتے ہیں۔ مثلاً موسےٰ
مقدس پولوس۔ اتھاناسیوس اور لوتھر +

(۲) یسوع کی عظمت۔ ہمارے خداوند نے مندرجہ بالا تینوں طریقوں سے
دُنیا پر تاثیر ڈالی یعنی اپنی سیرت اور افعال اور اقوال سے۔ مگر ایک فرق قابلِ لحاظ
ہے کہ اُسکی شخصیت سے محض اُسکی سیرت ہی مراد نہیں ہے چنانچہ اُسکے اول شاگردوں نے یہ
سوال نہ کیا کہ وہ کیا ہے۔ بلکہ یہ کہ وہ کون ہے؟ ان کا اصلی سوال یہ تھا کہ کیا وہ
مسیح ہے۔ اور بعد ازاں یہ کہ کیا وہ خدا کا بیٹا ہے۔ پس جب ہم دُنیا پر مسیح کی تاثیر
کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں کامل سیرت کی تاثیر سے بہت کچھ بڑھ کر ہے +

ہمارے خداوند کی شخصیت نے ایک ایسا نتیجہ پیدا کیا۔ جس کی نظیر تواریخ میں
پائی نہیں جاتی۔ یعنی جب اُس نے اپنے آپ کو دُنیا پر ظاہر کیا تو لوگوں کو اول
تسلیم کرنا پڑا کہ وہ مسیح ہے۔ اور بعد ازاں جُوں جُوں خیال ترقی کرتا گیا اُنہوں نے
اُس کو خدا کا مجسم بیٹا مان لیا +

اس امر کو صاف صاف پیش کرنے کی ضرورت دو وجہ سے لاحق ہوئی۔
اول۔ تو اس لئے کہ خیالات کا جو سلسلہ ہم اس کتاب میں پیش کرینگے وہ مسیح کی نسبت
مسیحی عقاید کا ایک جزو یا پہلو ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم اس امر کو مدِ نظر رکھیں۔ دوسری
وجہ یہ ہے کہ گو ہم خصوصاً مسیح کی تعلیم پر غور کرینگے۔ اس تعلیم کو معلم کی شخصیت سے
مطلق علیحدہ نہیں کر سکتے۔ فی الجملہ معلم اور اُس کی تعلیم کا جو قریبی تعلق مسیح کی ذات

میں پایا جاتا ہے وہ کسی اَور معلّم کی ذات میں موجود نہیں ہے +

(۳) یسوع کا منجّی ہونا۔ یہ بھی ضرور ہے کہ ہمارے خداوند کے کاموں کی ضرورت پر زور دیا جائے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ہم مسیح کو بطور معلّم کے خیال کریں۔ اور اس کے منجّی ہونے کو نظر انداز کر دیں۔ فی زمانہ جس طور پر مسیح کی شخصیّت کی عظمت اور غور کرنے والوں نے اس کے کفّارہ پر نظر انداز کر کے محض اس کے تجسّم کا طول وطویل بیان کیا ہے۔ بعینہ اسی طرح اندیشہ ہے کہ جو لوگ فقط مسیح کی تعلیم پر توجّہ کلی مبذول کرتے ہیں وہ اس کے تجسّم اور کفّارہ دونو کو نظروں سے غائب کر بیٹھیں۔ ہمیں یاد رکھنا ضرور ہے کہ تجسّم جو مسیح کی شخصیّت کا صحیح بیان ہے اور نجات جو اُس کے کاموں کا نتیجہ ہے اور وہ خیالات جو اُس کی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں تینوں فی الحقیقت لازم وملزوم ہیں۔ اس لئے جب اس رسالہ میں ہم خصوصاً مسیح کے معلّم ہونے پر غور کرینگے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم باقی ان عظیم اجزائے کو نظر انداز کر دینگے جن سے ہمارے خداوند نے دنیا کو متاثّر کیا۔ جب ہم اپنے خداوند کی خصوصاً اُن تصوّرات پر غور کرینگے جو اُس کی دینی تعلیم کا ماحصل ہیں تو وہ باقی اجزاء بھی اپنی اپنی جگہ پر پیش کئے جائینگے +

(۴) اناجیل۔ اپنے خداوند کے خاص خیالات کو مطالعہ کرنے کے لئے ضرور ہے کہ یسوع مسیح کے ان الفاظ پر جو چاروں اناجیل میں مندرج ہیں غور کی جائے۔ ہمیں ان الفاظ کو لیکچر پر کہنا ہے۔ اور ان میں سے ایسے اصولی خیالات کا نقشہ جمانا ہے جن کا اظہار متکلّم کو منظور تھا۔ اس امتحان سے معلوم ہو جائیگا کہ کیسے اہم خیالات ایک سوسائٹی کی ساخت کا مادہ لئے ہوئے ان الفاظ میں موجود ہیں ہمیں مسیح کے الفاظ کو اسی طرح لینا ہے جیسے وہ

اناجیل میں پائے جاتے ہیں۔ یہ موقع نہیں ہے کہ انجیل نویسوں کی تصانیف
کو ایسا انتقادانہ دیکھا جائے جس سے ثابت ہو جائے۔ کہ چاروں اناجیل میں
فی الحقیقت مسیح کے الفاظ مندرج ہیں۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی تحقیقات کرنا
چاہے تو اس مضمون کے متعلق دیگر بہت سی ضخیم کتب کا مطالعہ کرنا چاہیئے
مگر بعض تصورات ہیں جو سادہ لوح اشخاص کے شبہات رفع کرنے کے
لئے کافی ہیں +

(۵) مسیح کے الفاظ۔ اوّل یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اناجیل خواہ کسی
طریق پر اپنی موجودہ صورت میں لکھی گئیں یعنی خواہ انجیل نویسوں نے موجودہ
سامان کو کام میں لاکر یا زبانی روایات پر انحصار کر کے یا ہر ایک لفظ کو الہامی
طور پر حاصل کر کے اناجیل کو لکھا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے خداوند
کے الفاظ اپنی ہی روشنی سے منوّر ہیں۔ وہ اپنی سند خود ہی ہیں ویسے الفاظ
اَور کہیں پائے نہیں جاتے۔ وہ اس شخص کی طرح جس کے مُنہ سے وہ نکلے
بے نظیر ہیں۔ وہ سادہ لیکن پُر معنی ہیں۔ وہ اطمینان سے بھرے ہوئے مگر
تیزی کا جُزو لئے ہوئے ہیں۔ وہ نرم مگر ہولناک ہیں۔ ان میں ایک خاص
طاقت ہے کہ جس سے متکلّم کا بااختیار ہونا ثابت ہوتا ہے۔ وہ بلا منّت ترغیب
وحجّت سامع کو قایل کر دیتے ہیں۔ اس کے دل کے آر پار نکل جاتے ہیں۔
اور اس پر مکاشفہ کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اُن کا حُسن آج کے دن بھی
عالموں اور جاہلوں کے لئے ویسا ہی تازہ اور حیرت بخش ہے۔ جیسا کہ اس
زمانہ میں تھا جب عوام مسیح کی تعلیم سے دنگ ہو جاتے تھے +

(۶) چوتھی انجیل۔ جو بیان اوپر کیا گیا ہے وہ زیادہ تر ان الفاظ
پر عاید ہوتا ہے جو اول تین اناجیل میں موجود ہیں۔ عہد جدید کا پڑھنے

والا خواہ وہ کیسا ہی بے علم کیوں نہ ہو جب ان اناجیل سے مقدس یوحنا کی کی انجیل کی طرف رُخ کرتا ہے تو اس کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ وقت پیش آتی ہے انجیل چہارم کے مکالمات کا طرز اور مضمون بعض اُمور کی نسبت باقی تین اناجیل کے الفاظ سے قطعی جداگانہ ہے۔ اوّل تین انجیلوں میں مسیح کے الفاظ مختصر بے ربط اور ضرب الامثال کی صورت پر ہیں۔ مضمون ان سب کا بہت کچھ اخلاقی ہے۔ مقدس یوحنا کی انجیل میں تقاریر۔ لبنی۔ مدلل اور زیادہ تر دینی امور پر ہیں۔ اوّل الذکر صحائف میں معاملات کو خصوصاً انسانی پہلو سے دیکھا گیا ہے۔ ان میں معیشت اور چال چلن کے متعلّق قوانین اور بادشاہت کا حال مندرج ہے۔ چوتھی انجیل میں زیادہ تر بادشاہ اپنی شخصیّت۔ اپنے اختیارات۔ اپنے باپ اور اپنے لوگوں کے ساتھ اس کے تعلّق کا بیان مندرج ہے*

(۷) چوتھی انجیل باقی اناجیل کا تتمہ۔ مندرجہ بالا دقّت ایسی بھاری نہیں ہے جیسی کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ یوحنّا کی انجیل بطور تتمّہ کے ہے۔ اس کا مُدعا شروع سے آخر تک یہی ہے کہ جو واقعات اور تعلیم دیگر اناجیل میں مندرج نہیں ہیں ان کو درج کیا جائے۔ مصنّف باقی اناجیل سے ضرور واقف ہو گا۔ ورنہ کیونکر ممکن ہے کہ اُس نے دیگر مصنفوں کے بیانات کو اپنی کتاب میں نہیں دُہرایا۔ اور اگر ایسا کوئی بیان کر بھی دیا جو کسی دیگر انجیل نویس نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے تو اس کا ہمیشہ کوئی خاص مُدعا ہُوا کرتا ہے۔ مثلاً پانچہزار اشخاص کو سیر کرنے کا حال درج کیا گیا ہے اس وجہ سے کہ اس پر ایک ضروری تقریر کا دارومدار تھا جس سے ناظرین کو آگاہ کرنا منظور تھا*

(۸) چوتھی انجیل کے مضامین۔ ابھی بیان کیا گیا ہے کہ چوتھی انجیل درحقیقت بطور "تتمہ" کے ہے مگر یہ دعوے اس دقت کو رفع کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ چوتھی انجیل کے طرز بیانات اور مضامین میں اور باقی تین اناجیل کے بیانات میں فرق کیوں ہے۔ اس فرق کا ایک اَور باعث ہے۔ ہمارے خداوند کی سوانح عمری میں اس سے زیادہ حیرت انگیز امر کوئی نہیں کہ وہ کیسے عجیب طور پر ہر ایک شخص یا جماعتوں کے خاص حالات کے مطابق اپنے آپ کو موافق بنالیتا تھا۔ ہر موقع پر وہ وقت کے حالات اور ضروریات کے مطابق کارروائی کرتا تھا۔ لوگوں کی رُوحانی ضروریات کے متعلق اُس کا کوئی خاص مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ اناجیل میں ظاہرانہ موافقت کی بھی خاص وجہ ہے۔ چوتھی انجیل میں مسیح کی خدمت کا ایک ایسا پہلو دکھایا گیا ہے۔ جو باقی تین اناجیل میں بہت تھوڑا نظر آتا ہے۔ عام طور پر پہلی تین اناجیل میں مسیح کی اس خدمت کا بیان ہے جو اُس نے گلیل میں کی۔ مگر چوتھی انجیل میں ان مواقعہ کے کاموں اور تقریروں کا ذکر ہے جب وہ یروشلم میں آیا کرتا تھا۔ جو لوگ ہمارے خداوند کو گلیل میں ملتے تھے۔ وہ یروشلم کے آدمیوں سے بالکل مختلف تھے۔ اوّل الذکر مقام میں محنتی اور پیشہ ور عوام سے رابطہ پڑتا تھا۔ مگر یروشلم میں تعلیم یافتہ کاہن اور منطق اور علم الٰہیات کے عالم موجود ہیں۔ جو مختصر تمثیلیں اور صداقت کے چمکنے والے جواہرات اوّل تین اناجیل کے صفحات کی زینت ہیں وہ گلیل کے باشندوں کے عین مناسب حال تھے۔ وہ فہم کو فریفتہ کرنے والے تھے۔ دل اُن کو قبول کرکے فوراً قابض ہوجاتا تھا۔ ان الفاظ کی سند اپنے اندر ہی موجود تھی۔ لیکن یروشلم کے باشندوں

کے لئے کچھ اور درکار تھا۔ وہ بغیر کافی ثبوت کے کسی کے اختیار کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ سامعین کی دلی حالت کے مطابق ہمارے خداوند نے بھی اپنا طرزِ کلام بدل دیا۔ اس نے بڑی شفقت سے اپنے اختیار کی بنیاد اور کیفیت یروشلم میں پیش کی۔ مگر چوتھی انجیل اور باقی اناجیل کے طرز تحریر میں جو فرق بظاہر معلوم ہوتا ہے وہ واقعی اس قدر نہیں ہے جیسا کہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ چاروں اناجیل میں مسیح کی تعلیم مختصر فقروں میں بیان کی گئی ہے اور ہر کہیں حجت مسلسل دلیل کی صورت میں پیش نہیں کی گئی۔ بلکہ عجیب بے ساختہ حرکات کی صورت میں ترقی کرتی جاتی ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ وہ بطور الہام کے پیش کی گئی ہے نہ بطور مناظرہ یا مباحثہ کے۔

(۹) چوتھی انجیل کی تعلیم۔ مندرجہ بالا وجہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خداوند کی تعلیم کا مضمون جو یوحنا کی انجیل میں پایا جاتا ہے۔ باقی اناجیل کے مضمون سے کیوں اختلاف رکھتا ہے۔ گلیل کے باشندے ابن اللہ کے عہدے اور شخصیت کی نسبت گہری صداقتوں کو سمجھنے کے قابل نہ تھے۔ انہیں امثال اور تمثیلوں کا دودھ درکار تھا۔ یروشلم میں ہمارے خداوند کو اپنی اور اپنی بادشاہت کی نسبت دعوے پیش کرنا ضرور تھا۔ ورنہ وہ کیونکر کہہ سکتا تھا۔ کہ اے یروشلم یروشلم! کتنی بار میں نے چاہا کہ تیرے لڑکوں کو جمع کروں (متی ۲۳: ۲۷)۔ حاصل کلام یہودیہ والی تعلیم گلیل والی تعلیم کا ضرور تتمہ تھی جس کے بغیر وہ ناکامل اور ادھوری رہ جاتی۔ ذرا گہری نظر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں کیسا باہمی قریبی تعلق ہے۔ ہمارے خداوند کی شخصیت اور تعلیم کا کوئی پہلو یا عقیدہ ایسا نہیں ہے جو مقدس یوحنا کی انجیل میں موجود ہے۔ اور باقی اناجیل میں کم و بیش پایا نہیں جاتا

مسیح اور اُس کی خدمت اور تعلیم چاروں اناجیل میں فی الحقیقت یکساں ہے +

(۱۰) چاروں اناجیل کی موافقت۔ چونکہ عہد جدید میں سے ہمیں کسی قدر تیقن کے ساتھ مضامین کو اخذ کرنا ہے۔ اس لئے مندرجہ بالا خیالات کا اظہار ضروری سمجھا گیا۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ قدیم خیال کے مطابق چاروں اناجیل کی مطابقت پر زور نہیں دیا گیا۔ چاروں اناجیل کو ملا کر اُن کے بیانات مسلسل طور پر مرتّب کرنے کی اب تک کوئی کوشش سراسر کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ انجیل کے بیانات ایسے صحیح اور تواریخی ہیں اور ایک انسانی اور الٰہی جزو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں کہ اس کے مضامین کو کسی مصنوعی ترکیب سے معرضِ ترتیب میں لانا ممکن نہیں ہے۔ جس اتفاق اور اتحاد کا ذکر یہاں پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ اندرونی اور روحانی اتفاق ہے۔ وہ کوئی محض لفظی یا کتابی اتفاق نہیں ہے۔ یہ اتفاق بلحاظ اس شخص کے ہے جس کا مکاشفہ اناجیل میں مندرج ہے۔ اور اس کی تعلیم کی یگانگت اور اس کی رُوح کی یکتائی جو شروع سے اخیر تک سرائت کرتی ہے اور بالآخر یہ چاروں کتابوں کا حقیقی اتّفاق ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کتابوں میں اختلاف اور فرق اور ایسے اُمور موجود ہیں جن کو خاص اور علیحدہ علیحدہ نظر سے دیکھا گیا ہے یہ کتاب گویا انسان کے ذریعے سے خدا کی طرف دیکھتی ہے اور انسانیّت ویسی ہی حقیقی ہے جیسی کہ الوہیّت ہے +

ہماری موجودہ تحقیقات کے مقاصد کے لئے یہی بیان کافی ہوگا کہ ہم اپنے خداوند کی تعلیم کے بنیادی اور حقیقی خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کرینگے یہ ضرور نہیں کہ جو سامان یا تعلیمات ہم استعمال کریں گے اُن کا مفصّل اور

مسیح اور اُس کی خدمت اور تعلیم چاروں اناجیل میں فی الحقیقت یکساں ہے*

(۱۰) چاروں اناجیل کی موافقت۔ چونکہ عہد جدید میں سے ہمیں کسی قدر تیقن کے ساتھ مضامین کو اخذ کرنا ہے۔ اس لئے مندرجہ بالا خیالات کا اظہار ضروری سمجھا گیا۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ قدیم خیال کے مطابق چاروں اناجیل کی مطابقت پر زور نہیں دیا گیا۔ چاروں اناجیل کو ملا کر اُن کے بیانات مسلسل طور پر مرتّب کرنے کی اب تک کوئی کوشش سراسر کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ انجیل کے بیانات ایسے صحیح اور تواریخی ہیں اور ایک انسانی اور الٰہی جزو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں کہ اس کے مضامین کو کسی مصنوعی ترکیب سے معرضِ ترتیب میں لانا ممکن نہیں ہے۔ جس اتفاق اور اتحاد کا ذکر یہاں پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ اندرونی اور روحانی اتفاق ہے۔ وہ کوئی محض لفظی یا کتابی اتفاق نہیں ہے۔ یہ اتفاق بلحاظ اس شخص کے ہے جس کا مکاشفہ اناجیل میں مندرج ہے۔ اور اس کی تعلیم کی یگانگت اور اس کی رُوح کی یکتائی جو شروع سے اخیر تک سرایت کرتی ہے اور بالآخر یہ چاروں کتابوں کا حقیقی اتّفاق ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کتابوں میں اختلاف اور فرق اور ایسے اُمور موجود ہیں جن کو خاص اور علیحدہ علیحدہ نظر سے دیکھا گیا ہے یہ کتاب گویا انسان کے ذریعے سے خدا کی طرف دیکھتی ہے اور انسانیّت ویسی ہی حقیقی ہے جیسی کہ اُلوہیّت ہے*

ہماری موجودہ تحقیقات کے مقاصد کے لئے یہی بیان کافی ہوگا کہ ہم اپنے خداوند کی تعلیم کے بنیادی اور حقیقی خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کرینگے یہ ضرور نہیں کہ جو سامان یا تعلیمات ہم استعمال کریں گے اُن کا مفصّل اور

مشرّح بیان کیا جائے ٭

(۱۱) مضمون کی تقسیم۔ ہمارے خداوند کی تعلیم رُو بہ ترقّی ہے۔ مگر یہ کوئی لازمی بندش نہیں ہے وہ نہ فقط بلحاظ اپنی زندگی اور خدمت کے بلکہ اپنے سامعین کی ضرورت اور رُوحانی قابلیّت کے حسب موقع اپنے کلام کا طریق اختیار کرتا تھا۔ مثلاً اُس تعلیم کا جو وہ عوام کو دیتا تھا اس کے ان کلمات کے ساتھ جو وہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتا تھا۔ اور پھر ان جوابات کے ساتھ جو وہ تعلیم یافتہ یہودیوں کے اعتراضات پر دیا کرتا تھا۔ مقابلہ کرنے سے یہ دعوے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے۔ مگر ہم اس کی تعلیم میں دو درجے نہایت صاف طور پر معلوم کر سکتے ہیں۔ اوّل حصہ میں زیادہ تر اخلاقی صداقت کا بیان ہے اس کا سب سے کامل اظہار پہاڑی وعظ میں پایا جاتا ہے۔ دوسرا درجہ خصوصاً دینیات کا ہے۔ اس کی بہترین نظیر اس بالاخانہ والی تقریر میں پائی جاتی ہے۔ جو یُوحنّا کی انجیل کے چودہ[۱۴]۔ پندرہ[۱۵] و سولہ[۱۶] ابواب میں مندرج ہے ٭

(۱۲) ہمارے خداوند کی تعلیم میں اخلاق و مذہب کا توصّل ہے۔ مندرجہ بالا دو درجوں کو صاف طور پر علیحدہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اخلاق اور دینی اجزاء ایک دوسرے سے علیحدہ واقع نہیں ہوئے وہ فی الحقیقت ایکدوسرے کو مکمّل کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اخلاقی تعلیم ہمیشہ دینی بنیاد اور ایک دینی مقصد رکھتی ہے۔ علیٰ ہذالقیاس دینی تعلیم اخلاقی ضروریات کو پورا کرتی اور اخلاقی طاقت کے منبع کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس توصّل کا نتیجہ یہ ہے کہ گو ہم اپنے خداوند کی تعلیم کے بنیادی خیالات کو اخلاقی اور دینی دوستوں میں تقسیم کریں تو بھی یہ معلوم ہو گا کہ جو خیالات قطعی طور پر اخلاقی

ہیں وہ دوسرے پہلو سے فی الحقیقت دینی بھی ہیں۔ مزید برآں یہ بھی واضح ہوگا کہ اخلاقی تعلیم ایک عام طور پر ضروری صداقت کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ اس خاص خدمت کا ایک ضروری حصّہ ہے جو مسیح دُنیا میں کرنے کو آیا تھا۔ جس طریق پر اُس نے دُنیا کی احتیاج کو رفع کرنا چاہا اُس میں اخلاقی تعلیم کا جُزو ایک ضروری امر ہے۔ مثلاً مسیح بادشاہت کی تیاری کے لئے توبہ کی منادی کرتا تھا۔ جب اُس نے عوام کو اخلاقی صداقتوں کی تعلیم دی تو اُس کی تعلیم گویا توبہ کی منادی بن گئی۔ غرض جب اخلاقی خیالات سے گذر کر دینی خیالات کی طرف رجوع کرینگے تو ہمیں وہ پُرانے تصوّرات نئی صورت میں اور نئی طاقت کو لئے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر اس نئی صورت اور نئی طاقت سے ثابت ہوگا کہ ہم اخلاقی عالم سے گذر کر رُوحانی عالم میں داخل ہوگئے ہیں۔

پہلا حِصّہ

اخلاقی تعلیم

پہلا باب

بادشاہت

(۱) بادشاھت۔ اوّل اس بادشاہت کی نسبت خیالات کو پیش کرنا ضرور ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ ضروری مضمون ہے۔ اور پھر ہمارے خداوند نے اپنی تعلیم میں اس کو مقدم رکھا۔ مُقدّس متی کی انجیل ہیں اس کو عموماً آسمان کی بادشاھت کہا گیا ہے۔ دیگر مقامات میں اس کو خدا کی بادشاھت کا نام دیا گیا ہے۔ دونوں الفاظ کا ایک ہی مطلب ہے۔ مگر اوّل نام سے اس بادشاہت کی حقیقت یعنی اُس کا آسمانی ہونا واضح ہوتا ہے۔ اور دوسرا نام اس بادشاہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس ہیں حکمران ہے +

(۲) اس خیال کا وجود عہد عتیق میں۔ خداوند کی بادشاہت کا خیال

عہدِ جدید سے شروع نہیں ہوا۔ عہدِ عتیق میں جو عقیدہ خُدا کی وحدانیت اور خالق ہونے کا پایا جاتا ہے۔ اس سے خدا کی سلطنت کا خیال بھی نکلتا ہے۔ پھر خدا کا جو تعلق برگزیدہ قوم اسرائیل کے ساتھ تھا اس میں بھی قطعاً خُدا کی بادشاہت کا خیال پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اس قوم کو ابراہام کے زمانہ سے خاص اپنے لئے پسند کیا۔ اس لئے اس قوم کو غلامی سے رہائی بخشی۔ اس کے ساتھ عہد قائم کیا اور بالآخر اس کو سرفرازی بخشنے کے لئے اپنی پروردگاری اور حفاظت کا ہاتھ اُس پر رکھا اس طور پر یہودی قوم کے خیال میں یا یہواہ اپنی قوم کا بادشاہ تھا۔ قوم اسرائیل کی ملکی سلطنت الہٰی حکومت کہلاتی تھی۔ اور یہ سچ بھی تھا۔ کیونکہ خواہ قاضی یا بادشاہ یا انبیا ان پر حکمران تھے انسانی حاکم اس یہوداہ کے نائب یا جانشین سمجھے جاتے تھے۔ جو اسرائیل کا اصلی بادشاہ تھا +

(۳) یہ بادشاہت ایک عالمگیر برکت تھی۔ ابتدا ہی سے جو برکت اسرائیل کو ملی وہ ایک وسیع اور عالمگیر برکت کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ (دیکھو پیدائش ۱۲: ۳ + ۱۸: ۱۸ وغیرہ) مگر ہمیشہ یہ اندیشہ تھا کہ بسبب تنگ خیالی کے جو حقوق ایک برگزیدہ قوم کو حاصل تھے وہ ایک ایسی برکت سمجھی جائے جو فقط تھوڑے آدمیوں کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو۔ باوجود اس کے خدا کی بادشاہت کی نہایت عالمگیر رویت عہدِ عتیق میں پائی جاتی ہے۔ یہودی سلطنت کے زوال اور بابل کی اسیری نے انبیاء کی حدِ نگاہ کو نہائت وسیع کر دیا۔ یہ خصوصاً دانیل نبی کی کتاب سے واضح ہوتا ہے چنانچہ اسی صحیفہ کے دوسرے باب کی چوالیس آئت میں مذکور ہے کہ آسمان کا خُدا ایک سلطنت برپا کریگا جو تا ابد نیست نہ ہو گی اور تا ابد قائم رہیگی۔

اور پھر دانئیل کے ساتویں باب کی ۱۳ و ۱۴ آیات میں مرقوم ہے کہ میں نے رات کی رویتوں کے وسیلے دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص آدمزاد کی مانند آسمان کے بادلوں کے ساتھ آیا۔ اور قدیم الایّام تک پہنچا۔ وہ اُسے اُس کے آگے لائے اور تسلّط اور حشمت اور سلطنت اُسے دی گئی کہ سب قومیں اور اُمتیں اور مختلف زبان بولنے والے اُس کی خدمتگزاری کریں اُس کی سلطنت ابدی سلطنت ہے جو جاتی نہ رہیگی۔ اور اس کی مملکت ایسی جو زائل نہ ہوگی۔ یہ ایک نہائت ضروری مقام ہے۔ کیونکہ غالباً ہمارے خداوند نے اِبنِ آدم کا خطاب اپنے لئے اسی میں سے اختیار کیا۔ اور اسی مقام میں ایک بڑی عالمگیر بادشاہت کا خیال نہائت صفائی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے جس پر ایک انسان حکمران ہوگا جو فوق العادت عظمت کے نشانات کے ساتھ آئیگا اور اللہ تعالےٰ سے اپنا اختیار حاصل کریگا۔

(۴) بادشاہت کی نسبت یہودیوں کا خیال۔ مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ جب ہمارے خداوند نے خدا کی بادشاہت یا آسمان کی بادشاہت کی بابت تعلیم دی۔ تو اُس نے اپنے یہودی سامعین کے دل میں ایسے خیالات کو موجزن کیا۔ جن سے وہ پیشتر آگاہ تھے۔ مگر اس آگاہی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے خداوند کی تعلیم کو یہودیوں نے اپنے ادنےٰ درجہ کے روحانی خیالات کے ساتھ مطابق کرلیا۔ خصوصاً یروشلم میں ملکی پیشوا ایک بادشاہت کے آنے کی راہ ہمیشہ دیکھتے تھے۔ جو فی الحقیقت ایک دُنیاوی بادشاہت تھی۔ وہ رومی سلطنت کے جُوئے سے نفرت رکھتے تھے اور ملکی آزادی کے لئے ترس رہے تھے۔ مکابی زمانے کے معرکوں اور فتوحات کی نسبت ایسی ایسی روایات مروّج تھیں۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ آزادی کا حاصل کرنا ناممکن نہیں ہے

اس قسم کے خیالات عوام النّاس میں پھیلے ہوئے تھے۔ اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خداوند کے زمانہ میں ایک ایسے عظیم الشّان شخص کی انتظار کی ہو رہی تھی جو خدا کی برگزیدہ قوم پر حاکم اور مسلّط ہونے والا تھا (دیکھو متی ۲: ۱ وغیرہ و ۱۱: ۳ + لوقا ۳: ۱۵ + یوحنّا ۱: ۱۹ وغیرہ و ۴: ۲۵ وغیرہ وغیرہ) یہودی لوگ بڑی آرزو کے ساتھ ایک ایسی سلطنت کا رستہ دیکھ رہے تھے جو اُن کے خیال میں تمام دُنیا کو اپنے احاطۂ تسلّط میں لے آئیگی۔ بادشاہت کا یہ دُنیاوی خیال ایسا مستحکم ہو گیا تھا کہ رسولوں کو بھی اس سے پیچھا چھڑانا دشوار ہو گیا تھا۔ (دیکھو متی ۲۰: ۲۱ وغیرہ + اعمال ۱: ۶ وغیرہ وغیرہ)*

(۵) یوحنّا اصطباغی۔ یوحنّا بپتسمہ دینے والے کے بھیجے جانے کی ایک خاص وجہ غالباً یہی تھی۔ اس کے آنے کا مدّعا یہ نہ تھا۔ کہ یہودیوں کے دلوں میں مسیح کی آمد کی تیاری کو پیدا کرے کیونکہ اس قسم کی تیاری تو پیشتر موجود ہی تھی اور نہائت زور سے موجود تھی۔ بلکہ اس کی آمد کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ عوام کے خیالات کو اس سلطنت کی ماہیّت کی نسبت صاف کرے۔ اور نیز اس آنے والے بادشاہ کی شخصیّت کی طرف صاف طور پر اشارہ کرے۔ اس لئے اس کی تعلیم کا خلاصہ یہی تھا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آ گئی ہے (متی ۳: ۲)۔ اس نے لوگوں کو سکھایا کہ بادشاہت کے لئے رُوحانی طور پر تیار کرنی چاہیئے اور اس طور پر بادشاہت کی ماہیت کو ظاہر کیا۔ (دیکھو متی ۳: ۱۰ سے ۱۲ + لوقا ۳: ۱۰ سے ۱۴)*

(۶) بادشاہت کی ماہیّت۔ ہمارے خداوند نے اپنی اول تعلیم یوحنّا اصطباغی کے الفاظ میں دی۔ یعنی توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت

نزدیک آگئی ہے (متی ۴: ۱۷) مسیح دُنیا میں خوشی کا پیغام لیکر آیا اور وہ پیغام بادشاہت کی خوشخبری کی نسبت تھا۔ (دیکھو متی ۴: ۲۳ و ۹: ۳۵ و ۲۴: ۱۴) انجیلی تواریخ کے صفحات میں ہر کہیں پایا جاتا ہے کہ مصنفوں کے اور نیز ہمارے خداوند کے خیال میں بادشاہت کی منادی ہی سب سے بڑھ کر خوشی پیدا کرنے والی چیز تھی۔ یہی خوشخبری کہلانے کے لائق تھی۔ بظاہر مابعد کے لفظ نجات کا مفہوم بھی شامل ہونے والا تھا۔ بادشاہت کی خوشخبری کے دینی پہلو کا ذکر پیچھے کیا جائیگا۔ فی الحال ہم صرف اس کے اخلاقی پہلو پر غور کرینگے۔ اور اس مدعا کی خاطر تمہیں بہت کچھ اس بادشاہت کے خواص کی نسبت جو ہمارے خداوند کے خیال میں تھا نظر انداز کرنا پڑیگا۔

(۷) بادشاہیت کی سوشیل ماہیت۔ بادشاہت کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضرور ہے کہ پہلے ہم اس لفظ کے معنی پر غور کریں۔ یونانی لفظ کا ترجمہ حکومت یا بادشاہت دونوں ہو سکتا ہے۔ مگر مترجم اور تمام صاحب ادراک عالم موخر الذکر لفظ کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ جس طور پر ہمارے خداوند نے اس لفظ کو استعمال کیا اس میں فی الحقیقت ایک سوسائٹی کا خیال پایا جاتا ہے۔ عام طور پر دیکھنے سے اس میں بادشاہ اور اُس کی رعایا کا خیال موجود ہے۔ اگر اوّل الذکر ترجمہ اختیار کیا جائے تو صحیح قیاس حاصل کرنے کے لئے حکومت کے لئے محکوم رعایا کا خیال پیش نظر رکھنا پڑیگا۔ بادشاہت محبت کا دیس ہے۔ جس میں خدا تخت نشین ہے۔ اِس لئے بادشاہت میں ایک مجموعی برکت کا خیال پایا جاتا ہے۔ یہ علیحدہ علیحدہ افراد کے لئے برکت نہیں۔ بلاریب یہ ہر ایک شخص کے لئے برکت تو ہے۔ مگر یہ برکت ہر ایک فرد کے لئے اس مجموعی برکت میں شامل ہے۔ ضرور ہے

کہ جب ہمارے خُداوند کی تعلیم کے اخلاقی پہلو پر غور کی جاتی ہے۔ تو اِس سادہ خیال کو مدّ نظر رکھا جائے۔ پہاڑی وعظ میں بادشاہت کے قانون پر بحیثیت مجموعی نظر دوڑاتے ہوئے سب سے اوّل اسی خیال کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے خداوند کے طرزِ تعلیم اور خصوصاً اس طریق سے جس سے وہ اخلاقی شریعت کا خلاصہ پیش کرتا ہے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اخلاق کو فی الحقیقت سوسائٹی کا قانون سمجھتا تھا ٭

(۸) مسیح کی اخلاقی تعلیم کی ماہیت۔ مسیح کسی مقام پر اخلاقی قوانین کا مجموعہ وضع نہیں کرتا۔ اور نہ چال وچلن کے متعلّق قواعد مرتّب کرتا ہے۔ اس نے کوئی نئے دس احکام شائع نہ کیئے بلکہ بجائے اُن کے اُس نے اصول قائم کیئے اور اُن کے اطلاق کی تعلیم دی۔ جس معنی میں دس احکام اخلاقی قوانین سمجھے جاتے ہیں وہ محض افعال کی تقسیم ہے جس میں نیک و بد اعمال کو اَمر اور نہی کی صورت میں سکھایا گیا۔ ہمارا خداوند اس قسم کے قاعدے وضع نہیں کرتا اور جہاں وہ بظاہر ایسا کرتا بھی ہے ذرا غور کرنے سے ثابت ہو جائیگا کہ وہ ایک پُرانے حکم کو لیکر ایک نئے اصول کی روشنی میں پیش کرتا یا یوں کہو کہ وہ نئے اصولوں کو لیکر اُن کے اطلاق کی مثالیں دیتا ہے [illegible] متی ۵ : ۲۱ سے ۴۸ و ۶ : ۱ سے ۹ و ۷ : ۱ سے ۶) رفتہ رفتہ معلوم ہو جائیگا [illegible] وانین اور ان اصولوں میں کیا فرق ہے فی الحال اس قدر یاد رکھنا [illegible] ۔ جو [illegible] ائیں وہ اصول ہیں۔ وہ ہمیں امورات کے اندرونہ [illegible] ن کا اطلاق فی الحقیقت عالمگیر ہے۔ اخلاقی [illegible] م کی طرح کیسے ہی ضروری اور مفید کیوں نہ ہوں [illegible] ی نہیں ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان سے

اخلاق کی بنیادی صداقت ظاہر نہیں ہوتی۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں عوام ایک اخلاقی قانون کو بظاہر دوسرے کے خلاف دیکھ کر تذبذب میں پڑ رہے ہیں۔ اور اس باہمی تخالف کا ایک ماحصل یہ ہے کہ بہت سے ہادی اور مجتہد نکل آئے ہیں جو اخلاقی مشکلات حل کرنے کا دعوٰے کرتے ہیں۔ مگر ہمارے خداوند کی تعلیم اس قسم کی تمام مشکلات سے اوپر پرواز کرتی ہے اور ایسے بھاری اصولوں تک پہنچ جاتی ہے جن میں باہمی تضاد ناممکن ہے۔

(۹) ہمارے خداوند کی اخلاقی تعلیم کی مشکلات۔ اگر مندرجہ بالا حقیقت کو ذہن نشین کر لیا جائے تو بخوبی معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے خداوند کی بعض مثالیں کیوں بظاہر خلاف عقل معلوم ہوتی ہیں۔ وہ چال چلن کے بھاری اصول کو خاص مثالوں کے ذریعہ سے واضح کرتا ہے۔ مثلاً انتقام کی نسبت اس کی تعلیم پر غور کرو۔ مسیح نے فرمایا جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دینا۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لیجائے اُس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ یہ اقوال اس وجہ سے حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں کہ وہ اس قسم کے شرعی حکم کہ "تو چوری نہ کرنا" کے ہمپایہ تصوّر کئے جاتے ہیں۔ مگر وہ ہرگز ایک پایہ پر نہیں ہیں۔ وہ اعلےٰ قانون محبّت کے عمل کی خاص نظائر ہی ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خداوند نے ایسی مثالوں کو منتخب کیا جو بالبداہت خلاف قیاس نظر آتی ہیں تاکہ ہمیں جُزو سے کُل کی طرف لے چلے۔ وہ یہ سکھایا چاہتا تھا کہ ہم خود انکاری کر کے اَوروں کی بہتری مدّنظر رکھیں۔

اور اگر ہم محبت کے اس اصول کو ہر امر میں پیش نظر رکھیں تو ممکن نہیں کہ ہم راہ راست سے منحرف ہوں کیونکہ اس قسم کے سب امور پر قانونِ محبت حاوی اور محیط ہے +

(۱۰) اخلاقی اصول متعلق بہ سوسائٹی ہیں۔ غور کرنے سے واضح ہوگا کہ وہ تمام اصول جو ہمارے خداوند نے پیش کئے مندرجہ بالا اعلیٰ قانون کے اظہار کا ایک دوسرا طریق ہے۔ خواہ وہ خدا کو سیرت کا اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیتا ہے۔ خواہ وہ اس اصول کو چال وچلن کا سنہلا قانون ٹھیراتا ہے کہ جو برتاؤ تم اَوروں سے چاہتے ہو وہی تم بھی ان کے ساتھ کرو۔ خواہ وہ اس اخلاقی شرط کو پیش کرتا ہے جو ہر ایک تائب کے لئے لازمی ہے (دیکھو متی ۶: ۱۴ و ۱۵) اِن تمام امور میں ہمارا خداوند ایسے اعلیٰ زینہ پر پہنچ جاتا ہے کہ جہاں سے صاف نظر آتا ہے کہ نیکی کا اصول ہر ایک کے ساتھ یکساں اور واحد ہونا چاہیئے اور کہ خودغرضی کیسی مکروہ چیز ہے +

(۱۱) احکام کا خلاصہ۔ جس صداقت کا ابھی بیان کیا گیا وہ شاید سب سے زیادہ اس مقام سے واضح ہوتی ہے جہاں احکام کا کامل خلاصہ مندرج ہیں۔ "خُداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبّت رکھ"۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اُس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے محبّت رکھ۔ انہی دو حکموں پر توریت اور انبیاء کی کتابوں کا مدار ہے۔ (متی ۲۲: ۳۷ سے ۴۰)۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ تعلیم فی الحقیقت سوسائٹی سے متعلّق ہے۔ اس میں اعلےٰ قانون محبّت کو اخلاقی شریعت کا لُب لباب ٹھیرایا گیا ہے۔ اور محبت کا اصول ہی سوسائٹی کا اعلےٰ ترین اصول ہے +

(۱۲) بادشاہت ایک سوشیل اصول ہے - غرض بادشاہت کا بنیادی خیال فی الحقیقت ایک سوشیل اصول ہونا ہمارے خداوند کی تمام اخلاقی تعلیم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے - جیسا کہ پیشتر ذکر کیا گیا - مسیح کی پہاڑی وعظ بادشاہت کا قانون ہے - یہ امر اس وعظ کے اوّل درجہ رکھنے اور بلحاظ اُن مضامین کے جن میں بادشاہت کی طرف بار بار اور صاف صاف اشارہ کیا گیا ہے - اور مجموعی طور پر تمام وعظ میں بادشاہت کے خیال پر اندر سے ایک ایسی جھلک پڑتی ہے جس سے اُس کی ہیئت ہی تبدیل ہو جاتی ہے - ہم ان قوانین کے اندرونہ جو سب پر حاوی ہیں نظر دوڑا سکتے ہیں - اور جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے - سو یہ ہے کہ بادشاہت فی الحقیقت ایک خاندان ہے جس میں اس عظیم الشّان باپ کا حکم جاری ہے خواہ اُس کو کسی نام سے تعبیر کرو - اس کی ماہیّت تو ظاہر ہی ہے - یعنی وہ ایک سوشیل دُنیا ہے جس میں ہر فرد کل مجموعہ افراد کے ساتھ برکت حاصل کرتا ہے - پہاڑی وعظ سے اس بادشاہت کی منزلت اور خواص کی بہت سی ضروری تعلیم حاصل ہوتی ہے *

(۱۳) مُبارکبادیاں - اس وعظ کے پہلے حصّہ میں وہ اقوال درج ہیں جن کو عموماً مبارکبادیاں کہتے ہیں - بعض اوقات گمان کیا جاتا ہے کہ اس مقام پر حقیقی مسیحی سیرت کا کامل اور علمی بیان ہے - یعنی ایک سیرت جسے بطور کامل نمونہ کے آسمان کی بادشاہت کے ہر ایک باشندے کو مدِّ نظر رکھنا چاہئے ایسی تفسیر کئی ایک وجوہات سے غلط معلوم ہوتی ہے - اوّل مقدّس متی و مقدّس لوقا کی انجیل میں مُبارکبادیاں وعظ کے شروع میں رکھی گئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بطور تمہید کے ہیں - اور باقی تعلیم کے لئے دیباچہ کا

کام دیتی ہیں۔ ہمارا خداوند کوئی باقاعدہ اخلاقی معلّم نہ تھا۔ تو بھی یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نیکیوں کے اس مشرّح بیان کو اپنے دیباچہ ہی میں رکھ دیا ہو۔ دوم۔ مُبارک ہونے کے لئے جو صفات اُن میں بیان کی گئی ہیں وہ ازقسم نواہی ہیں۔ متقدس لوقا کی انجیل میں تو سب کے سب اور مقدّس متی کی انجیل میں زیادہ حصّہ۔ اگر یہی حقیقی مسیحی سیرت کا بیان مانا جائے تو جو اعتراض مسیح کی اخلاقی تعلیم پر عموماً کیا جاتا ہے سچ ٹھیرتا ہے کہ بمقابلہ بُت پرستوں کے اس میں اخلاقی تعلیم کے مثبت پہلو پر عملی نیکی کا کوئی معیار پایا نہیں جاتا غالباً یہ بے بنیاد الزام ان مُبارکبادیوں کے مُدّعا کو درست طور پر نہ سمجھنے سے شروع ہؤا جس کو مسیحی مذہب کی تواریخ نے بار بار بڑے زور سے غلط ثابت کر دکھلایا ہے۔ سوم۔ اگر ان اقوال کے موقع کا تعلّق ہمارے خُداوند کی تمام زندگی کے ساتھ دیکھا جائے تو اس قسم کی غلط فہمی کا امکان ہی نہیں رہتا۔ یہ مُبارکبادیاں خصوصاً اس کی خدمت کے ابتدائی حصّہ سے متعلّق ہیں وہ اس وقت دنیا میں ایک نئے سلسلے کا اعلان دے رہا ہے۔ اور ایک خوشخبری کی منادی کر رہا ہے۔ وہ برکتوں کا اشتہار دیتا ہؤا آرہا ہے۔ اور ان لوگوں کی طرف مخاطب ہے جو اُن کی حاجت رکھتے ہیں۔ غرض یہ مُبارکبادیاں کامل سیرت کا بیان ہونے کی بجائے۔ ایسے اشخاص کی طرف خطاب ہیں جو بلحاظ اپنی ضروریات اور روحانی حالت کے ان برکات کے حاصل کرنے کے لائق ہیں جن کو مسیح دینے کے لئے آیا تھا +

(۱۴) مبارکبادیاں بطور تمہیدی تقریر کے۔ مندرجہ بالا خیال اس موقع کے خطابی الفاظ اور وعظ وغیرہ کے مضمون کے ساتھ کامل طور پر اتفاق رکھتا ہے۔ خواہ اس کو بحیثیت مجموعی یا علیحدہ علیحدہ مضامین کے لحاظ سے دیکھا

جائے۔ مقدّس لوقا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریر بعض درجہ کے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کی گئی۔ مقدّس متی کی انجیل میں اگرچہ عبارت غائب کے صیغہ میں درج کی گئی ہے۔ مگر اس کے موقع اور مفہوم سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک تقریر ہوگی۔ دونوں اناجیل میں جس برکت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ پہلے ہی فقرہ میں صاف طور پر بادشاہت کے نام سے نامزد کی گئی ہے۔ اگلے فقروں میں وعدہ تو اُسی برکت کا ہے۔ مگر مختلف ضروریات کے لحاظ سے مختلف بیانات کی صورت میں ادا کیا گیا ہے +

(۱۵) مُبارکبادیوں کا مطلب۔ حاصل کلام وعظ کے اس حصّہ کا مضمون یُوں ادا ہو سکتا ہے۔ بادشاہت ان لوگوں کے لئے برکت لئے ہوئے آرہی ہے جو غریب ہیں۔ یعنی جو لوگ اپنی رُوحانی احتیاج کو محسوس کرتے ہیں اور وہ بھی جو اس دُنیا کے مال کے محتاج ہیں۔ وہ افسوس کرنے والوں کو تسلّی دیتی ہے رونے والوں کو ہنساتی ہے۔ رُوح کی بھُوک کو سیر کرتی ہے حلیموں کو ورثہ دیتی ہے۔ اور رحمدلوں پر رحم کرتی ہے۔ ان کو جو پاک دل ہیں وہ خُدا کا دیدار دکھاتی ہے اور صُلح کرانے والوں کو خُدا کے خاندان میں داخل کرتی ہے۔ یہ بادشاہت ایسی بھاری برکت ثابت ہوگی کہ اس کی خاطر لعن طعن اور تکلیف اُٹھانا خوشی کا باعث ہوگا۔ جو شخص پُرانی تفسیروں اور روایات کو جو تنگ خیالی کا نتیجہ ہیں نظر انداز کر کے اپنے آپ کو اس پہاڑی وعظ کے موقع پر کھڑا کرتا ہے بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ان مُبارکبادیوں کا حقیقی مطلب یہی ہے +

(۱۶) دُنیا کے ساتھ مقابلہ۔ جس بات کو ہمارے خُداوند نے واضح کرنا چاہا وہ اس قسم کی مسرت نہیں تھی۔ جو بالآخر اس بادشاہت میں حاصل ہوگی بلکہ ان

اقسام کی سیرت یا یُوں کہو کہ ایسی روحانی حالت جو اس بادشاہت کو قبول کرنے کے لائق تھی۔ اسی وجہ سے وہ زیادہ تر نفی شرائط کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً ضروریات اور غم اور تکالیف اور مصیبتیں۔ وہ محتاجوں کی خاطر آیا تھا۔ مزید براں یہ بھی ظاہر ہے کہ ہمارا خداوند اپنی اخلاقی تعلیم کے ابتدا ہی میں اپنی بادشاہت اور دُنیا کی بادشاہتوں کے درمیان مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ دُنیا کی بادشاہتیں مغروروں۔ دولتمندوں اور زبردستوں کے لئے تھیں۔ غریبوں۔ حلیموں۔ رحمدلوں۔ پاک دل والوں۔ صلح کرانے والوں کا ان میں کوئی دخل نہیں تھا۔ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بُت پرست اقوام کی تہذیب غلامی پر مبنی تھی۔ اور ان کی سلطنتیں تابع اقوام پر کھڑی تھیں۔ ان زمانوں میں زبردست قوموں کا جبر زمانہ حال کے مقابلہ میں زیادہ سخت تھا۔ مسیح نے ابتدا ہی میں واضح کر دیا کہ میری بادشاہت میں وہ لوگ حصّہ اور برکت پائینگے جو دُنیا کی بادشاہتوں میں رانده اور خستہ ہیں*

(۱۷) بادشاہت میں داخل ہونے کی شرائط۔ بلاریب مسیح کا مُدّعا یہ بھی تھا کہ جس صداقت کو اُس نے مختلف اوقات پر مختلف الفاظ میں ادا کیا اس کو اس وقت یُوں ظاہر کرے۔ کہ جو لوگ اس بادشاہت میں داخل ہونے اور اُس کی برکتوں میں حصّہ پانے کو ہیں۔ ان کو غریب اور افسوس کرنے والے اور حلیم اور روحانی برکتوں کے بھُوکے پیاسے اپنے قصورواروں کو معاف کرنے پر تیار اور راست بازی کی خاطر دُکھ تکلیف اُٹھانے والے ہونے چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں پر یہ دکھایا گیا ہے کہ توبہ بادشاہت کے لئے حقیقی تیاری ہے۔ اور یہی بات اس دعوت سے مترشح ہوتی ہے جو متّی کے بارھویں باب کی اٹھائیسویں آیت میں مندرج ہے۔ کہ اے محنت اُٹھانے

والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں آرام دونگا
پھر اس قول سے کہ بادشاہت میں داخل ہونے کے لئے آدمی کو چھوٹے
بچّوں کی مانند ہونا ضرور ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسی خیال کا اظہار ہے +

(۱۸) مبارکبادیاں ایک تیاہی نہیں۔ ان مبارکبادیوں کی مندرجہ
بالا بحث اس لئے ضروری ہے کہ اس سے ہم پر روشن ہو جاتا ہے۔ کہ اس
بادشاہت کی نسبت ہمارے خداوند کے بنیادی خیال کو کس نظر سے دیکھنا
چاہیئے۔ وعظ کے اس حصّہ میں ہمارے خداوند کے اپنے تمہیدی الفاظ
ہیں جو اس نے ایسے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمائے ہیں جن پر
وہ اس بادشاہت کے قانون ظاہر کرنے کو تھا یہ آیندہ تعلیم کے لئے رستہ
تیار کرنے والے تھے۔ ہمارے لئے بھی یہی الفاظ بہترین تیاری ہیں +

(۱۹) بادشاہت کا دنیا کیساتھ تعلق۔ یہ ظاہر کرنیکے بعد کہ یہ بادشاہت اعلیٰ درجہ کی برکت
ہے۔ مسیح اُسکا دنیا کیساتھ تعلق یا رشتہ کا مفصّل ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ بادشاہت نہ
صرف اُن لوگوں کے لئے ہی جو اسمیں شریک ہیں۔ برکت ہے۔ بلکہ ساری دنیا کے لئے بھی ہے چنانچہ
وہ فرماتا ہے کہ "تم زمین کے نمک ہو۔ تم دنیا کے نور ہو۔ اور پھر یہ کہ تمہاری روشنی آدمیوں کے
سامنے چمکے تاکہ وہ تمہارے اچّھے کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے بڑائی
کریں" (متی ۵: ۱۳ سے ۱۶) اس بادشاہت کی نسبت یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ ایک ایسا سلسلہ ہے
جو دُنیا کی زندگی سے بالکل علیحدہ ہے اور اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ برعکس اسکے دُنیا
کی ہستی کا اور قیام کا انحصار اُس تعلق پر ہے جو اُس بادشاہت کے ساتھ رکھتی ہے۔ ایک
معنی میں اس بادشاہت کے وجود کا مدعا ہی یہی ہے کہ دُنیا کو فائدہ پہنچائے اگر دُنیا
کو اسکی ذات سے کچھ حاصل نہ ہو تو وہ اپنی حقیقی صفت ہاتھ سے دے بیٹھیگی جیسا کہ نمک
صاف کرنیوالی اور سڑاہٹ سے بچانیوالی شے ہے۔ اسی طرح یہ بادشاہت اس دنیا کو

جسمیں وہ موجود ہی صاف کرتی اور سراسر خراب ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔ اگر اس بادشاہت کے شرکاء اس صفت کو ضائع کر دیں جو بطور شرکاء ان میں موجود ہی تو وہ بالکل ناکارہ ہو جائینگے وہ اپنے اصلی جوہر کو کھو دینگے۔ اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائیگا۔ پھر وہ کسی کام کا نہیں سوائے اس کے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے پاؤں کے نیچے روندا جائے ✤

(۲۰) بادشاہت دُنیا کا نور ھے۔ یہ بادشاہت دُنیا کے نور کی مانند بھی ہے۔ وہ اسی غرض سے دنیا میں رکھی گئی ہے۔ اور اگر وہ نہ چمکے تو وہ اپنی ہستی کے مُدّعا کو پورا کرنے میں قاصر رہتی ہے۔ چراغ اس لئے نہیں جلایا جاتا کہ اس کو ڈھانپا جائے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ چراغدان پر رکھا جائے۔ اور سب کو جو گھر میں رہتے ہیں روشنی دے۔ بعینہٖ اسی طرح اس بادشاہت کے شرکا کا فرض ہے کہ اُن کی روشنی چمکے۔ تاکہ دُنیا دیکھ کر اُن کے باپ کی جو آسمان میں ہے ستایش کرے۔ اس دوسری مثال سے پہلی کی نسبت اس بادشاہت کی دنیا میں ہستی کا مدعا زیادہ صاف طور پر واضح ہوتا ہے اس کا مدعا یہ ہے کہ لوگ خدا کی ستایش کریں۔ یا یوں کہو کہ یہ بادشاہت ایک سوشل ہستی ہے جو دنیا میں موجود ہے جو اپنی حقیقی قدرتی زندگی سے دنیا کو خدا کے ساتھ ملا سکتی ہے۔ اگر بادشاہت کے شرکا اپنے پایہ کے مطابق زندگی بسر کریں تو وہ دنیا کو بدل ڈالنے کا ذریعہ ہونگے۔ اور اس زمین کی بادشاہتوں کو خداوند اور اس کے مسیح کی بادشاہت بنا ڈالینگے (مکاشفات ۱۱: ۱۵) غرض یہ بادشاہت دنیا میں ہو کر دنیا کو بدل ڈالنے کا ایک بڑا بھاری ذریعہ ہے ✤

(۲۱) بادشاہت کی ترقی کی تمثیلیں۔ جو صداقت اس وعظ میں

مختصر الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ وہ ہمارے خداوند کی مابعد کی تعلیم اور خصوصاً اس کی تمثیلوں میں زیادہ مفصل اور مبسوط طور پر سکھائی گئی ہے تمثیلوں کے ایک مجموعہ میں بادشاہت کے بھیدوں کا بیان کیا گیا ہے (متی ۱۳: ۱۱)۔ بعض میں یہ سکھایا گیا ہے کہ بادشاہت ایک ادنےٰ آغاز سے ایسی بھاری طاقت ہو جائیگی کہ تمام دنیا کو اپنے تسلط میں لے آئیگی چنانچہ رائی کے دانہ کی تمثیل (متی ۱۳: ۳۱ و ۳۲) اور خمیر کی تمثیل (متی ۱۳: ۳۳) اور بیج کے خفیہ طور پر اُگنے کی تمثیل (مرقس ۴: ۲۶ سے ۲۹) میں اس کا ذکر آیا ہے۔ دوسری تمثیلوں میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ بڑھنے کے وقت بدی نیکی کے ساتھ ملی جلی رہیگی اور کہ جب تک یہ دُنیا قائم ہے اس طریق کے خلاف واقع ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ کڑوے دانوں کی تمثیل (متی ۱۳: ۲۴ سے ۳۰) اور مچھلیوں کے جال کی تمثیل (۱۳: ۴۷ سے ۵۰) سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارا خداوند آیندہ زمانہ کی طرف نظر دوڑا کر اُسی وقت کی طرف دیکھ رہا تھا جب اُس کی بادشاہت لوگوں میں سرایت کر رہی ہوگی بدی کے ساتھ مقابلہ کر کے اس پر غالب آئی ہوگی اور رفتہ رفتہ بنی آدم کو ایسا بدل ڈالیگی کہ وہ اس زمانۂ عظیم کی آمد کے لئے تیار ہو جائینگے جس کو دنیا کا آخر کہا گیا ہے۔ (متی ۱۳: ۳۹)*

(۲۲) بادشاہت کا تعلق زمانہ حال اور آیندہ کے ساتھ۔

اس امر کی نسبت بہت بحث ہو چکی ہے کہ آیا مسیح اپنی بادشاہت کو آیندہ زمانہ میں ظاہر ہونے والی سمجھتا تھا۔ یعنی دُنیا کے آخر نمایاں ہونے والی تھی یا زمانہ حال میں موجود اور انسانی تواریخ کے تمام زمانوں میں جاری رہنے اور بڑھنے والی خیال کرتا تھا۔ مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ ہمارا خداوند

اپنی بادشاہت کی نسبت مؤخرالذکر خیال رکھتا تھا وہ اس کو دنیا کا نور قرار دیتا ہے جو دُنیا میں موجود اور روشن ہے۔ وہ رائی کے دانہ کی مانند ہے جس بڑھتے بڑھتے ایک درخت ہو جانا تھا۔ مگر ایک معنی میں یہ بادشاہت آیندہ زمانہ میں آنے والی تھی۔ ہمارے خدا نے اپنی اُمت کو ہمیشہ کے لئے یہ دُعا مانگنا سکھایا کہ تیری بادشاہت آئے (نیز دیکھو لوقا ۲۱: ۳۱ و اعمال ۱: ۶ و ۷ بمقابلہ متی ۲۴: ۳۶) اور پھر اس کی تعلیم میں شروع سے آخر تک ایک بڑی بھاری آخری تکمیل کا خیال پایا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض اوقات اس بادشاہت کو ایک ایسی کاملیت کی حالت قرار دیا جاتا ہے جس کی طرف تمام چیزیں ترقی کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ بعض اوقات اس کو ناکامل حالت یا جزوی حقیقت ٹھیرایا جاتا ہے جو اس ناکامل دنیا میں فی الحقیقت موجود ہے۔ اس اوّل معنی میں ہمیں اس بادشاہت کے لئے ہمیشہ دُعا مانگتا ہے۔ دوسرے معنی میں جہاں کہیں مسیح کی رُوح زندہ ہے اور کام کرتی ہے وہ بادشاہت ہمارے درمیان موجود ہے ✦

(۲۲) سلسلہ قدیم کے ساتھ اس کا تعلّق۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ہمارا خداوند آیندہ زمانہ کے حدود پر نظر دوڑاتا تھا اور اپنی بادشاہت کے بدی کے ساتھ مقابلہ کا خیال کرتا تھا جب تک کہ وہ غالب ہو کر کاملیت حاصل نہ کرے اس میں بادشاہت کا تعلق دُنیا کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ مگر مسیح زمانہ ماضی پر نگاہ کرتا تھا اور اس نے بادشاہت کا تعلّق قدیم سلسلے کے ساتھ نہایت صاف الفاظ میں ادا کیا۔ پہاڑی وعظ کے جس حصّہ میں اس مضمون کا بیان ہے شاید ہمارے خداوند کی ساری تعلیم میں وہ سب سے مفصل اور باترتیب [illegible] ہے (متی ۵: ۱۷ سے ۴۸) مسیح کوئی تباہی

کا طوفان مچانے والا نہ تھا۔ نہ قدیم سلسلے کو منہدم کرنے یا ردی ٹھہرانے نہ آیا تھا۔ چنانچہ اُس نے فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں (متی ۵: ۱۷) جو بادشاہت مسیح نے زمین پر قائم کی وہ کسی گذشتہ سلسلے کی جابرانہ رخنہ اندازی سے نہیں بلکہ باقاعدہ اور جائز ترقی کے قاعدے سے شروع کی۔ اُس نے فرمایا کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلیگا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے *

(۲۳) شریعت کی تکمیل۔ جب ہمارا خداوند ذکر کرتا ہے کہ میں شریعت کو پورا کرنے آیا ہوں تو وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے کئی ایک معنی ہو سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہم اس کے مدعا کو سمجھیں۔ اس فقرہ سے یہ مراد ہو سکتی ہے کہ میں شرع کے احکام کی تعمیل کرنے آیا ہوں۔ مگر آیندہ آیات جن میں سترھویں آیت کے مندرجہ اصول کا اطلاق درج ہے ایسی تشریح کے خلاف ہے۔ سترھویں آیت سے اٹھتالیسویں آیت تک جو عبارت لکھی گئی ہے اس کے مضمون کا اکٹھا ملا کر دیکھنا چاہیئے۔ سترھویں آیت میں وہ عام اصول مندرج ہے جس کو عملی طور پر مابعد کی آیت میں روشن اور مشرح کیا گیا ہے ان فقروں میں سلسلہ قدیم کے چند قوانین اور اصولوں کو لیکر ان پر نظر ثانی کی گئی ہے اور اُن کی طریق کا تکمیل سمجھایا گیا ہے۔ اُنیس اور بیس آیات میں ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ قدیم احکام اس بادشاہت میں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ بلکہ پیشتر کی نسبت سے بھی بہت زیادہ توجہ کے ساتھ اُن کی تعمیل ضروری ہے۔ اور پھر ہمارا خداوند بتاتا ہے کہ اس تعمیل سے کیا مُراد ہے یعنی ان احکام کو لفظی طور پر نہیں بلکہ ان کے اندرونے معنی کے لحاظ سے بجا لانا

چاہیئے۔ اس سے شریعت کے اندرونی معنے بھی ظاہر ہو جائینگے اور ایک ایسا اخلاقی سلسلہ قائم ہو جائیگا۔ جس میں تمام شریعت بہت بہتر طور پر عمل میں آئیگی اسی معنی میں مسیح شریعت کو پورا کرنے آیا تھا۔ بدیں لحاظ یہ بادشاہت کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہی وہ سلسلہ تھا جس کے لئے شریعت اور انبیاء تیاری کر رہے تھے ✛

(۲۵) اس خیال پر ایک تواریخی نظر۔ جب ہم بادشاہت کا تعلق جو قدیم سلسلہ کے ساتھ ہے اس تعلق کے ساتھ ملاتے ہیں جو اسے دُنیا کی آیندہ تواریخ کے ساتھ حاصل ہے تو ہمارے خداوند کا وہ خیال جو اسے اپنی بادشاہت کی نسبت تھا کسی قدر ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور وہ خیال کیسا عجیب ہے یعنی یہ بادشاہت ایک عظیم سوشل انتظام ہے جس میں گذشتہ تعلیم کا خلاصہ اور توریت اور انبیا کی تعلیم کی تکمیل پائی جاتی ہے۔ جو تمام آیندہ زمانہ کی انسانی تواریخ کے ساتھ ترقی کرتی اور بڑھتی جاتی ہے اور ہر قسم کے لوگوں کو اپنی زندگی میں شریک کرتی ہے۔ جو بدی سے سراسر محفوظ تو نہیں مگر آخر کار کاملیت کے درجہ تک پہنچ جائیگی ✛

(۲۶) بادشاہت کا تعلق اقوام کے ساتھ۔ بادشاہت کی نسبت جو خیال ہمارے خداوند کی تعلیم سے بتدریج قائم ہوتا گیا ہے۔ بعض امور میں کسی قدر وضاحت کا محتاج ہے۔ ہمارے خداوند نے اپنی خدمت کو عموماً برگزیدہ قوم اور برگزیدہ ملک کی حدود تک محدود رکھا۔ چنانچہ اس نے ایک غیر قوم کے ایک آدمی کو ایک موقع پر جواب میں فرمایا کہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا (متی ۱۵: ۲۴) باوجود اس کے بعض ضروری مقامات سے یہ ظاہر ہے کہ اس کا مدعا اپنی بادشاہت کو

عالم گیر بنانے کا تھا۔ چنانچہ وہ متی ۸ باب ۱۱ و ۱۲ آیات میں فرماتا ہے کہ بہتیرے پورب اور پچھم سے آکر ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے ساتھ آسمان کی بادشاہت میں کھانے بیٹھیں گے مگر بادشاہت کے بیٹے باہر اندھیرے میں ڈالے جائیں گے (نیز دیکھو لوقا ۱۳: ۲۹) اس مقام کے آخری حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر اقوام بھی اس بادشاہت میں شامل ہونگی۔ پھر متی ۲۱ باب ۴۳ آیت میں یوں آیا ہے کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائیگی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائیگی اور یوحنا ۱۲ باب ۳۲ آیت میں یوں لکھا ہے کہ میں اگر زمین سے اونچے پر چڑھایا جاؤنگا تو سب کو اپنے پاس کھینچ لونگا اور متی ۱۸ و ۱۹ میں ہے کہ تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ۔ ان مقامات سے زیادہ صاف طور پر وہی مدعا ثابت ہوتا ہے جو رائی کے دانہ اور خمیرا اور مچھلیوں کے جال کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے یا جو کچھ صریح الفاظ میں متی ۱۳ باب ۳۸۔ آیت میں مرقوم ہے کہ کھیت دنیا ہے۔ غرض ہمارے خداوند کا مدعا یہ تھا کہ اس کی بادشاہت عالمگیر ہو۔ عالمگیر بلحاظ اپنی وسعت اور پایہ کے اور یہی مقصد اس خطاب کے ساتھ جو اُس نے اپنے لئے پسند کیا اور جس کو اُس نے کسی اَور خطاب کی نسبت زیادہ کثرت سے استعمال کیا یعنی ابن آدم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

(۲۷) بادشاہت کی عظمت۔ ہمارے خداوند کی تعلیم میں اعلےٰ ترین نیکی اور پسندیدہ شئے اور ہر ایک فرد بشر اور بنی آدم اور دُنیا کے لئے برکت کا باعث ہے۔ جس کی خاطر سب کچھ چھوڑ دینا چاہیئے یہ صداقت ان تمثیلوں میں سے بعض میں بیان کی گئی ہے جو خصوصاً اس بادشاہت کی ماہیت سے متعلق ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ آسمان کی بادشاہت کھیت میں ایک چھپے

ہوئے خزانہ کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے پاکر چھپادیا اور اُس کی خوشی میں جاکر اپنا سارا مال بیچ ڈالا اور اس کھیت کو مول لے لیا (متی ۱۳: ۴۴) پھر لکھا ہے کہ آسمان کی بادشاہت اس سوداگر کی مانند ہے جو عمدہ عمدہ موتیوں کی تلاش میں تھا جب اُسے بیش قیمت موتی ملا تو جاکر اپنا سارا مال بیچ ڈالا اور اسے مول لے لیا (متی ۱۳: ۴۵ و ۴۶) ان تمثیلوں کے ساتھ ان تمام مقامات کو ملا کر پڑھنا چاہیئے جن میں ہمارا خداوند اپنے تئیں اپنی بادشاہت کے ساتھ واحد قرار دیتا ہے۔ اور اپنے لئے رُوح کی اعلےٰ ترین محبّت اور اطاعت قبول کرتا ہے۔ بلکہ اگر ضرور ہو تو انسان اپنی سب سے عزیز شے ہر روز تصدّق کرے (دیکھو متی ۱۰: ۳۷ سے ۳۹ و ۱۶: ۲۴ سے ۲۸ و مرقس ۸: ۳۴ سے ۳۸ و لوقا ۹: ۲۳ سے ۲۷ و ۱۴: ۲۶ سے ۳۳)÷

(۲۸) پہاڑی وعظ میں اس عظمت کی طرف اشارات جس پہلو سے ہم اس مضمون کو دیکھ رہے ہیں اس کے متعلّق پہاڑی وعظ میں سب سے ضروری مقام وہ ہے جو متی کے چھٹے باب کی انیس سے ۳۴ آیت تک مندرج ہے۔ یہ مقام ہمارے خداوند کی اخلاقی تعلیم میں ایک نہایت اعلےٰ درجہ رکھتا ہے عموماً اس کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک نہایت فصیح اور عمدہ عبارت ہے جس سے دو سبق حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی دنیاوی لالچ کے خلاف اور فکرمندی کے خلاف نصیحت۔ اکثروں کے زعم میں جو کچھ اس سے زیادہ اس موقع سے نکل سکتا ہے وہ سوائے مشکلات کے اور کچھ نہیں حقیقی مشکل یہ ہے اور ہمیشہ سے رہی ہے کہ یہ تعلیم انسان کو ایسی حالت میں ڈال دیتی ہے جو یا تو ناممکن اور یا نامناسب ہے جس آدمی کے

سر پر بہتوں کی ہستی کا دارومدار ہے اور جن کی پرورش کرنیکے لئے محنت کرنا ضرور ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پرندوں اور پھولوں کی طرح زندگی کا ضروری سامان بلا محنت دستیاب نہیں ہوسکتا اور اگر اُس کو کہا جائے کہ فکرمند مت ہو خدا پروردگار ہے تو وہ اس نصیحت کو کیسا نامعقول سمجھے گا۔ دوسری جانب ایسے آدمی بھی ہیں۔ جو خود فارغ البال ہیں یا جن کے سر پر کسی کی پرورش کا بوجھ نہیں۔ اگر ایسوں کو کہا جائے کہ فکرمند مت ہو خدا پروردگار ہے کیونکہ وہ ہوا کے پرندوں اور میدان کے پھولوں کے لئے اسباب مہیا کرتا ہے تو کیا یہ نصیحت اُن کو بگاڑنے والی نہ ہوگی۔ کیا ایسی تعلیم سے وہ اَور زیادہ کاہل نہ ہو جائینگے۔ کیا انسان پرندوں پھولوں سے اسی امر میں فوقیت نہیں رکھتا کہ اس کی ضروریات اس کے جسم اور دماغ کی محنت کے ذریعہ مہیا کی جاتی ہیں اور کیا زندگی کی فکریں اس اخلاقی انتظام کا حصہ نہیں ہیں جو خدا نے انسان کی زندگی بسر کرنے اور اُس کے قواء کو ترقّی دینے کے لئے مقرر کیا ہے ؞

(۲۹) اس مقام کی تفسیر کا نقص۔ اصل بات یہ ہے کہ جو تفسیر اس مقام کی کیجاتی ہے وہ ناقص ہے۔ اس کے کئی ایک وجوہات ہیں۔ اس مقام میں جو نصیحت متفکر ہونے کے خلاف کی گئی ہے وہ ایک خفیف معاملہ کو نہایت طول طویل عبارت میں پیش کیا گیا ہے۔ بدین خیال پہاڑی وعظ کے عجیب اختصار کے لحاظ سے اور نیز عام طور پر مسیح کے اخلاقی اقوال کا خیال کر کے ایسی لمبی عبارت میں نفس مضمون بہت ہی قلیل ہے پھر یہ مقام اس وعظ میں نہایت ہی عمدہ اور اعلےٰ درجہ کا ہے۔ شاید ہمارے خداوند کے تمام اقوال میں اس سے بڑھ کر اَور کوئی شاندار مقام نہ ہوگا۔ پھر اس تعلیم کو وعظ کے ایسے

وسطی مقام میں جگہ دی گئی ہے جس سے اُس کی کسی قدر ضرورت مترشح ہوتی ہے۔ ایسا مقام ایسے موقع پر ہمارے خداوند کی اخلاقی تعلیم کا مرکزی اور اعلےٰ ترین خیال ضرور ظاہر کرتا ہوگا۔

(۳۰) بُت پرست اور مسیحی اخلاق کا مقابلہ۔ عموماً کہا گیا ہے کہ مسیحی اخلاق زیادہ تر نفی صورت رکھتے ہیں اور کہ مسیحی معلموں نے اخلاقی تعلیم میں بہت کچھ نواہی پر زور دیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تعلیم میں اکثر تو ایسا اور ویسا انکار پر جیسے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مگر ایسی تعلیم جو اخلاقی زندگی کو راہ راست پر اوامر کی صورت میں لے جانے والی ہو بہت کم پائی جاتی ہے اپنی صورت میں ہمارے خداوند کی تعلیم جو اس وعظ میں پائی جاتی ہے بہت کچھ دس احکام کے نفی الفاظ میں پائی جاتی ہے اور اس کا نفس مضمون بھی زیادہ تر نہی ہے۔ باستثنائے چند مختصر مقامات کے (متی ۵: ۱۳ سے ۱۶ و ۴۴ سے ۴۸) یہی حال چھٹے باب کی اُنیس آیت تک پایا جاتا ہے جس بھاری موقع کا ذکر ہم کر رہے ہیں وہ باوجود اپنی نفی صورت کے ایک ایسا عظیم اثباتی قانون قائم کرتا ہے جو تمام زندگی پر حاوی ہے۔ یہاں پر وہ اثباتی اصول ہے جو اس اعتراض کا ایک دندان شکن جواب ہے کہ چونکہ بُت پرستوں کے عام اخلاق میں ایسے طاقتور اصول تھے جنہوں نے بہادروں کو پیدا کیا اس لئے اُن کے اخلاق مسیحی اخلاق سے بلند و برتر ہیں۔ اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے تواریخ شاہد ہے کہ مسیحی بہادر کسی امر میں بُت پرست بہادروں سے کم نہ تھے۔ جس اصول نے اس نتیجہ کو پیدا کیا اس کا ذکر کرنا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

(۳۱) زندگی کا کام کیونکر کرنا چاہیئے؟ اخلاقی تعلیم کا بہترین معیا اس سوال کا جواب ہے کہ انسان اپنے روزانہ فرائض کو کیونکر ادا کرے۔ زندگی

کا کام کس طور پر کیا جائے اگر علم اخلاق کا معلم نواہی پر زور دینے اور گناہوں سے باز رکھنے پر زور دیتا رہے تو وہ انسانی زندگی کے بڑے بھاری حصہ کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ اگر وہ اپنی پوری توجہ اخلاق کے بہادرانہ پہلو کی طرف مبذول کرتا ہے تو اس میں بھی اسی قسم کا نقص پایا جاتا ہے۔ اکثر لوگ اپنا زیادہ وقت اپنے فرائض کا حساب کرنے میں خرچ کرتے ہیں اُنہیں ایک ایسے اصول کی ضرورت ہے جو ان کو اپنے فرض کو صحیح طور پر پورا کرنے میں مدد دے بدی کی ممانعت نیکی کی اجازت نہیں ہے۔ مثلاً کاہلی سے باز رکھنا محنت کرنا نہیں سکھاتا۔ فی الحقیقت ایک ایسے اثباتی اصول کی ضرورت ہے جو انسانی رُوح میں حرکت پیدا کر کے اس کی محنت میں ایک نئی رُوح پھونک دے انسان ایک ایسے مقصد کا محتاج ہے جو اُس کے معمولی روزانہ کاروبار کو ویسے ہی صحیح اور عمدہ طور پر پورا کرنے میں مددگار ہو سکے جیسا کہ خودنثاری کے بڑے بھاری کاموں میں ÷

(۳۲) ہمارے خداوند نے اس مشکل کو کیونکر حل کیا۔ پہاڑی وعظ کا ایک بڑا بھاری حصّہ ہے جس میں عام لوگوں کی زندگی اور کام کا خاص بیان ہے۔ اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کیونکر بسر کرنی چاہیئے اور کام کیونکر کرنا چاہیئے اکثر لوگ اپنے وقت اور محنت کا زیادہ حصّہ اپنی روٹی کمانے میں صرف کرتے ہیں اس بڑے اور ضروری تصرف کو صحیح طور پر کیونکر کرنا چاہیئے ہمارا خداوند اس سوال کے جواب سے پہلوتہی نہیں کرتا۔ وہ اس کا جواب صاف الفاظ میں دیتا ہے وہ فرماتا ہے کہ زر کے لئے کام مت کرو دنیاوی منافع کے لئے محنت نہیں کرنا چاہیئے۔ اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چُراتے ہیں۔ بلکہ اپنے لئے

آسمان پر مال جمع کرو۔ اگر تم دنیاوی فائدے کے لئے محنت کرو تمہاری محنت ایک ایسی فی نفسہٖ بے ثبات شئے کے لئے ہوگی جو باقی رہنے والی نہیں۔ ابدی چیزوں کے لئے محنت کرو۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک گہری وجہ ہے اگر تم اپنی زندگی کو صراط المستقیم پر چلانا چاہو تو اس کا ایک ہی بڑا مقصد ہونا چاہیئے ورنہ نامناسبت اور ناکامیابی ہوگی۔ تمہاری آنکھ صاف ہونی چاہیئے کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کرسکتا۔ اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کرے تو سخت گڑبڑ مچ جائیگی۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے +

(۳۳) مقصد کی تعریف۔ اگر تم خدا کی خدمت کرنے کا فیصلہ کرلو اور ان چیزوں کے لئے زندگی بسر کرو جو پائدار ہیں تو تمام گڑبڑ جاتی رہتی ہے اور تمام فکرمندی زایل ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ نہ اپنی جان کے لئے فکر کرو کہ ہم کیا کھائینگے یا کیا پیئینگے نہ اپنے بدن کے لئے کہ کیا پہنینگے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بہتر نہیں۔ خدا پرندوں اور جنگلی سوسنوں کی ضروریات کو مہیا کرتا ہے اس لئے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائینگے یا کیا پیئینگے یا کیا پہنینگے۔ یہ بُت پرستوں کی طرز معاشرت ہے ان سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں رہتی ہیں تمہارے آسمانی باپ کو معلوم ہی ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو بلکہ تم پہلے اس کی بادشاہت اور راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائینگی +

(۳۴) مندرجہ بالا تعریف کی کمالیت۔ یہ تمام فقرہ جو خوبصورتی اور عظمت میں لاثانی ہے اور جس میں عجیب اعادے پائے جاتے ہیں۔ اس اصلی مقصد کی ایک نہایت کامل تعریف کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس میں صاف آنکھ کے ہدف کا ذکر ہے یعنی بادشاہت اور خدا کی راستبازی۔ یہ تعریف

اس وجہ سے نہایت کامل ہے کیونکہ اس میں چال چلن اور سیرت کے دو متضاد پہلوؤں سے اس حقیقی مقصد کی تعریف کی گئی ہے۔ ہم آگے چل کر اسکی تعریف کی کمالیّت کو شاید بہتر طور پر سمجھ سکینگے۔ جبکہ ہم سیرت کے اس اعلےٰ زینہ پر غور کرینگے جو ہمارے خداوند نے ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ فی الحال ہم فقط اس پہلو پر غور کرینگے جو بادشاہت کے چال چلن کے مقصد کی نسبت ہے +

(۳۵) مشکل کا دفعیّہ۔ جب اس بڑی تعریف پر غور کی جاتی ہے تو یہ تمام مقام روشن ہو جاتا ہے۔ اور تمام مشکل جو پریشانی میں ڈالنے والی تھی جاتی رہتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے۔ کہ ہم انسانی زندگی کے تمام اجزاے کو ان کے صحیح تناسب میں دیکھتے ہیں۔ ہمیں دنیاوی مقاصد اور عارضی ثواب کی نیت سے زندگی بسر کرنا نہیں چاہیئے خواہ وہ محض زندگی کے ضروریات یا دولت یا عزت یا طاقت اور ایسی عشرت کا اسباب کیوں نہ ہو جن کا حصول دنیا کے لوگ اپنے لئے اپنا ہدف بنا لیتے ہیں۔ حقیقی قاعدہ یہ ہے کہ بادشاہت کے لئے زندگی بسر کرو۔ بادشاہت کی تلاش کرو تو زندگی کی ضروریات بھی تمہیں مل جائینگی۔ اس لئے تمہیں فکرمند ہونا نہیں چاہیئے اور یہ کوئی ایسا قانون نہیں جو نامکمل التعمیل ہو۔ تمام راست اور عمدہ زندگی کا یہی حقیقی قانون ہے۔ جس شخص نے محض روٹی کمانے یا دولت حاصل کرنے کی خاطر کچھ کیا اُس نے کبھی کوئی حقیقی نیک کام نہیں کیا دنیا کے لوگ چھوٹے چھوٹے کاموں میں اسی اصول کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جو چھوٹی باتوں پر صادق آتا ہے وہی بڑی باتوں کے لئے بھی صحیح اصول ہے۔ جو شخص روپیہ کمانے کے لئے جیتا ہے وہ ہمیشہ ایک ادنیٰ اور حقیر درجہ کا آدمی ہوتا ہے خواہ وہ ایک معمولی حیثیت کا آدمی ہو یا لکھ پتی ہو۔ ہر قسم کا نیک کام اعلےٰ مقاصد کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ فاعل

اپنے اندر محسوس کرتا ہے کہ جو کام میں کر رہا ہوں وہ اس کی معمولی قدر و منزلت سے بڑھ کر گراں قدر ہے۔ اگر وہ اپنے دل میں اس بات کا قائل نہ ہو تو اس کا کام ادنےٰ درجہ کا ہوگا اگر فعل کی اس حقیقی قدر کو مدنظر نہ رکھا جائے تو کوئی آدمی اپنی پوری پوری طاقت خرچ نہ کریگا یہ بات جیسی کہ ایک مدبّر یا شاعر یا کسی اہل صنعت پر صادق آتی ہے ویسی ہی ایک ادنےٰ مزدور کے لئے بھی صحیح ہے۔ اگر انسان اپنا کام روٹی کمانے سے بڑھ کر کسی اور مقصد کے لئے نہیں کرتا تو اُس کی زندگی پر حیف ہے ؂

(۳۶) حقیقی اور اعلےٰ ترین نیکی۔ جو شخص مذکورہ بالا طریق پر کام کرتا ہے وہ جانتا ہے خواہ وہ اس علم کی ماہیّت سے واقف نہ ہو کہ جو کچھ میرا حقیقی فرض ہے وہ کچھ ایسی قیمت رکھتا ہے جس میں روپیہ یا ثواب کے خیال سے کچھ بڑھ کر فائدہ ہے۔ اس کے لئے وہ فعل فی الحقیقت نیک اور راست ہے اس قسم کا خیال فقط ایک امر کو مدنظر رکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے اور جس کو یہ ایک سنجیدہ اور غور کرنے والا شخص اپنے دل کے اندر محسوس کریگا تمام حقیقی کام کرنے والوں کے لئے اپنے نیک افعال کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے فقط ایک ہی ہدف ہے ایک ہی اعلےٰ خیال ہے جو اخلاقی دنیا میں تمام حقیقی کارندوں کی نیکیوں کو یگانگت کے بند میں وابستہ اور پیوستہ کر دیتا ہے۔ یہ خیال اعلےٰ ترین نیکی کا خیال ہے جس کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے جس میں سب کی نیکی ہر ایک شخص کی نیکی ہے۔ اور ہر ایک فرد کی نیکی سب کی نیکی ہے۔ غرض صحیح زندگی کا کامل معراج یہ ہے کہ ایک ایسی سوشل دُنیا ہو جس میں ہر ایک شخص کی زندگی کا اصول آخر کار وہی ہو جو مجموعی طور پر سب کی زندگی کا ماحصل ہے۔ فی الجملہ محبت کی بادشاہت ہر ایک نیک زندگی کا

حقیقی معراج ہونا چاہیئے +

(۳۷) بادشاہت کے لئے زندگی بسر کرنا - مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ حقیقی زندگی وہی ہے جو بادشاہت کے لئے بسر کی جاوے - جو شخص ایمانداری کے ساتھ اپنے فرض کو ادا کرتا ہے وہ بادشاہت کے لئے جیتا ہے خواہ وہ محنت کش مزدور ہو یا سلطنت کے اعلےٰ امور پر غور کرنے والا مشیر ہو - خواہ وہ شاعر یا نبی ہو کر اپنی اپنی ودیعت شدہ لیاقتوں کو کام میں لا رہا ہو یہ سب کے سب جب اپنے فرائض کو حقیقی طور پر بجا لاتے ہیں ایک ایسے نتیجے کے لئے محنت کر رہے ہیں جو فی الحقیقت قابل قدر ہے اور جو آخر الامر خدا کی بادشاہت کے خیال میں تحلیل ہو جاتا ہے - وہ شخص نیک عمل کرتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ یہ میرا فرض ہے مجھے اس کو دل و جان سے کرنا چاہیئے - اس قسم کا تمام عمل بادشاہت کے لئے ہے +

(۳۸) سادہ سی روٹی - جو شخص مندرجہ بالا طریق سے کام کرتا ہے ہمیشہ دیکھیگا کہ زندگی کی ضروریات اس کو مل جاتی ہیں - مسیح فرماتا ہے کہ پہلے بادشاہت کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں یعنی زندگی کی ضروریات بھی تمہیں مل جائینگی - جنہوں نے اس کا تجربہ کیا ہے انہوں نے اس کو سراسر راست پایا ہے نیکی کرنے والا روٹی کا محتاج نہیں ہوتا - وہ روٹی کے لئے زندگی بسر نہیں کرتا - مگر جس قدر خوراک اُسے اپنی زندگی کے لئے درکار ہے اُسے مل جاتی ہے +

(۳۹) ہمارے خداوند کی تعریف افضل ترین ہے - وعظ کے جس حصہ پر ہم اس وقت غور کر رہے ہیں (متی ۶: ۱۹ سے ۳۴) اس میں ہمارے خداوند کی تعلیم کی فضیلت اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ یک قلم اعلےٰ ترین بلندی پر پہنچ جاتا ہے - اور ایک جھلک میں انسانی زندگی کی اندرونی

حقیقت اور اُس کی تمام محنت و مشقت و فکرات کو منکشف کر دیتا ہے وہ ہم کو دکھاتا ہے کہ خدا اور آسمان دنیا کے معاملات کی حقیقی کنجی ہیں۔ اُنیسویں صدی کے بہترین اخلاقی فلسفے نے جو کچھ نہایت دقیق الفاظ میں ظاہر کیا وہ مقام زیر بحث میں موجود ہے۔ اور نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے اس میں ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ انسان کا اعلےٰ ترین ہدف محبّت کی بادشاہت ہونا چاہیئے بلکہ معمولی کاروبار میں بھی اسی کو مدّنظر رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ بھی سبق حاصل ہوتا ہے۔ کہ جو اس طریق پر عمل کرتے ہیں وہ فکرمند ہونے سے بچ جاتے ہیں*

(۴۰) اس تعلیم کی اندرونی حقیقت۔ مگر ہمارا خداوند اس مقام پر ہم کو فقط اخلاقی ہدف کی اعلےٰ ترین تعریف ہی نہیں بتاتا بلکہ وہ اس کا اندرونہ بھی ہمارے سامنے روشن کر دیتا ہے یہ علّت غائی عظیم باپ کی محبّت ہے حقیقی عامل نہ فقط خدا کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی مرضی کو بھی پورا کرتا ہے خدا ایسا باپ ہے جو اپنی تمام مخلوقات کی ضروریات کو پورا کرتا ہے عامل کو چاہیئے کہ اپنا کام ایمانداری کے ساتھ کرتا جائے اور اپنی زندگی مناسب طور پر بسر کرتا جائے اور اس کا آسمانی باپ اس کو بھول نہیں جائیگا۔ خدا پرندوں اور پھولوں کی خبرگیری کرتا ہے وہ اپنی ذات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اور خدا ان کی ضروریات کو رفع کرتا ہے مگر انسان اُن اعلےٰ صفات کے مطابق جو خدا نے اس ودیعت کی ہیں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنی فطرت کے قوانین پر عمل کرتا ہے۔ یعنی جو شخص بادشاہت کے لئے جیتا ہے وہ عظیم باپ اس کی بھی ضروریات کو مہیا کریگا اس سے فکرمندی زائل ہو جاتی ہے۔ انسان کی فطرت پرندوں اور پھولوں کی فطرت سے اعلےٰ تر ہے کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے پھر یہ کیسا بڑھ کر یقینی امر ہے کہ خدا تمہاری ضروریات کو بھی

رفع کریگا۔ ایک اور پہلو سے بھی یہی دلیل ایک اُور معاملہ پر صادق آتی ہے۔ بعض چیزیں ہیں جن کے لئے انسان کو خدا پر انحصار رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہی زیادہ ضروری اشیاء ہیں یعنی اس کا جسم زندگی اور اُس کے قواء کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بہتر نہیں۔ اور تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے۔ انسان زندگی کی اول ضروریات کو خود بخود مہیا نہیں کر سکتا وہ خدا کی عنایت ہیں اور وہ خدا جو زندگی بخشتا ہے زندگی قائم رکھنے کا سامان بھی مہیّا کریگا۔ مگر انسان کے لئے جس کو رُوحانی سرشت عنایت ہوئی ہے یہ لازمی شرط ہے کہ وہ اس بڑے قانون کے تابع رہے جس کے مطابق ساری عملی زندگی بسر ہونی چاہیئے یعنی یہ کے پہلے بادشاہت کی تلاش کرو۔ اگر اس قانون کو مدّ نظر رکھا جاوے تو خدا پر ایمان رکھنے والے انسان کے لئے نہ تو فکرمندی باقی رہتی ہے اور نہ اپنے کام کی نسبت بے پروائی یا غفلت ہو سکتی ہے ؛

(۱۴) یہ تعلیم کل نیکی کی کُنجی ہے۔ اس مقام میں جو تعلیم ہمارے خداوند نے دی اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ تمام نیک آدمیوں کی زندگی اور کام شروع سے کیا ہونا چاہیئے۔ وہی اُن کی زندگی میں جو کچھ ہے صاف اور واضح کر دیتا ہے۔ جس کو محسوس کر کے وہ عمل کرتے تھے۔ لیکن صاف طور پر سمجھ نہ سکتے تھے۔ جہاں کہیں بنی آدم حقیقی زندگی بسر کرتے اور نیک اعمال کرتے ہیں۔ وہیں بادشاہت کی تلاش ہو رہی ہے خواہ یہ ناکامل اور دُھندلے طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس تعلیم کا ایک اور بھاری فایدہ یہ بھی ہے کہ ہر زمانہ اور ہر قسم کے لوگوں کی زندگی میں جو کچھ فی الحقیقت نیک تھا اور جن پر سادہ ترین فرائض کو وہ بجالاتے تھے ان کو مسیحی امید اور دنیا کی نسبت مسیحی خیال کے متعلق کر سکتے

ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ تیری بادشاہت آئے تو اس درخواست سے خاص طور پر مسیحیت کا عملی پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وہ ہماری مشنری دُعا ہے جو ہر زمانہ میں مسیحی کلیسیا ہمیشہ مانگتی رہی ہے۔ تو بھی اس سے ہر زمانہ کے حقیقی کام کرنے والوں کی رُوح کا اظہار بھی ہوتا ہے سچ تو یوں ہے کہ تمام حقیقی خدمت بادشاہت کی تیاری ہے ❖

(۴۲) زمانہ حال کا اخلاقی خیال۔ زمانہ حال کا خیال ہمارے خداوند کی اس تعلیم کے رُخ پر زیادہ زیادہ چلا جاتا ہے۔ فی زمانہ اخلاقی تعلیم کو سوشل اصولوں کے ساتھ خاص طور پر متعلّق کیا جاتا ہے۔ سوسائٹی کی ساخت پر بہت بحث ہو رہی ہے۔ بعض کے خیال میں سوسائٹی پر لفظ زندہ اور اندرونی اتحاد کا اطلاق سب سے بڑھ کر اعلیٰ درجہ کا تصوّر سمجھا جاتا ہے۔ عملی طور پر اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر تمام اشخاص ایک دوسرے کے ساتھ ایسے مربوط ہوں کہ ہر ایک فرد سب کا لحاظ رکھے اور اس طور پر خود اپنی حالت کا لحاظ رکھے تو ایسی سوسائٹی کو کامل کہینگے اور انسان کی حالت بہترین ہوگی دوسرے الفاظ میں وُہ ہی خیال جو خدا کی بادشاہت کے مکاشفہ میں پایا جاتا ہے جس میں، ہمارے خداوند نے وہ اعلےٰ تصوّر ہمارے سامنے رکھ دیا اس میں ہر ایک انسان بلحاظ ایک بدن کا عضو ہونے کے اپنی شخصی مبارک حالت اُس وقت حاصل کر سکتا ہے جب وہ اپنے بادشاہ کے ساتھ اور باقی تمام اعضاء کے ساتھ جو اُس کے ہم خدمت انسان ہیں اپنے تعلّقات کو صحیح مقام پر رکھ سکتا ہے ❖

(۴۳) انسانی زندگی کا سوشل پہلو۔ موجودہ زمانہ کی خاص مشکلات کا حل مسیحی مذہب کافی اور وافی طور پر محض اس لئے کر سکتا ہے کہ اس میں مندرجہ بالا خیال پایا جاتا ہے۔ جن مسائل پر آج کے دن مسیحی معلّموں کو خاص طور پر

زور دینا ضرور ہے وہ یہی ہے یعنی خدا کی ابویت - بنی آدم کی اخویت - بادشاہت بطور ایک سوشل انتظام کے - اور خدا اور انسان کا باہمی تعلق جو بذریعہ کفارہ کے آشکارا ہوتا ہے - چند سال سے ہمارے ہر قسم کے خیالات خواہ وہ اخلاقی تفتیش ہو خواہ علم الٰہیات کے بحث مباحثہ ہوں خواہ وہ ملکی جھگڑے ہوں اُن سب کا یہی ایک مرکز ہے کہ انسانی ہستی ایک سوشل پہلو رکھتی ہے*

(۴۴) سوسائٹی اور ہر فرد بشر - دینیات کے باہر انسانی زندگی کے سوشل پہلو کی نسبت ایک ایسی لاینحل مشکل پیش آتی ہے جسکو مسیحیت پورے طور پر حل کر دکھاتی ہے - سوسائٹی بلحاظ ایک جماعت کے اگر فقط سائنس کی آنکھوں سے دیکھی جائے تو ہر ایک فرد کی شخصیت کو زائل کر دیتی ہے ترکیب یافتہ سوسائٹی ایکدوسرے تک قائم رہتی ہے اور پیچیدگی میں اور کسی قدر کاملیت میں بھی بڑھتی جاتی ہے - مگر جو اشخاص اس سوسائٹی کے شرکاء تھے معدوم ہو جاتے ہیں - گویا انسان سوسائٹی کے لئے قربان ہو جاتا ہے - فی الحقیقت یہ نقص ایک زہر قاتل ہے - جس کا علاج سائنس کی کسی حکمت سے نہیں ہو سکتا - مگر جب وہی تصور مسیحی طور پر پیش کیا جاتا ہے تو اُس میں کوئی نقص باقی نہیں رہتا - اس کے لحاظ سے ہر ایک شخص ایک ایسی رُوح ہے جو ابدی رُوح کے ساتھ مربوط ہے - ایک شخص ترتیب یافتہ اتحاد کا محض ایک جزو نہیں ہے بلکہ وہ عظیم آسمانی باپ کا فرزند ہے - اس کے سر کا ہر ایک بال گِنا ہوا ہے - اس لئے خواہ وہ سوشل جسم کا ایک عضو ہی ہے تو بھی وہ لامحدود اور اعلےٰ قیمت رکھتا ہے - وہ ایک ایسا مخلوق نہیں ہے جس کے معدوم ہونے سے کسی آیندہ زمانہ میں سوسائٹی اپنے کمال کو پہنچیگی - برعکس اس کے سوسائٹی کامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے شرکاء بجائے خود کُل کو کامل کرنے والے نہ سمجھے جائیں - بادشاہت

خدا کا خاندان ہے جس کا کوئی ممبر فراموش یا کم قدر نہیں ہو سکتا +

(۴۵) شخص کی قدر - مذکورہ بالا بیان سے دو ضروری مضامین منتج ہوتے ہیں۔ یعنی انسانی رُوح کی قدر اور اُس کا غیر فانی ہونا۔ مسیحی مذہب نے ایک نئے طور پر اور ایک بے نظیر طاقت کے ساتھ جو انسان کے دل تک پہنچ سکتی ہے سکھایا کہ شخص کی کیسی لامحدود قدر ہے۔ کھوئی ہوئی بھیڑ کی تمثیل۔ گم گشتہ درم کی تمثیل۔ مسرف بیٹے کی تمثیل سے اور نیز ہمارے خداوند کی ادنےٰ ترین اور حقیر اشخاص کو اعلےٰ ترین منزلت تک ممتاز کرنے سے اور اُس کی قسم کے الفاظ سے کہ تمہارے سر کے سب بال بھی گنے ہوئے ہیں اس کے خدا کی پروردگاری کے بیان سے (متی ۶: ۲۶ و ۳۰) شخص کی بے قیاس قدر کی تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ کوئی شخص حد سے زیادہ غریب یا خستہ حال یا رذیل نہیں ہے۔ مسیح کھوئے ہوئے کو ڈھونڈنے اور بچانے آیا۔ یہی وہ اصول تھا جس نے بنی آدم میں ایسی ہل چل مچا دی کہ آخر الامر شائستگی اور تہذیب کے ان طریقوں کو اُکھاڑ پھینکا۔ جن کے زیر نگین بہت سی قومیں اور فرقے مغلوب تھے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جو مشنریوں کو بت پرست قوموں اور ہمارے زمانہ حال کے بڑے بڑے شہروں کے گرے ہوئے باشندوں کے پاس بھیجتا ہے +

(۴۶) حیات جاودانی۔ شخص کی قدر و منزلت کے ساتھ آئندہ زندگی کا مضمون نہایت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ کسی شخص کو دوسرے کی خوشی کا ذریعہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ہر شخص بذات خود ایک مقصد ہے جو نہائت قدر کے لائق ہے۔ وہ عظیم باپ کا فرزند ہے۔ اور خواہ وہ آوارہ گرد ہو تو بھی باپ بڑی محبت کے ساتھ اُس کی خبر گیری کرتا ہے اس لئے بادشاہت کی تلاش اس غرض سے

نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ بلا لحاظ اپنے شرکاء کے بجائے خود ایک مقصد ہے۔ اس کی کاملیت اسی میں ہے کہ اس کا ہر ایک ممبر کامل ہے۔ وہ محبت کی بادشاہت اور رب عظیم کا خاندان ہے۔ چونکہ خدا ابدی ہے اس لئے وہ بھی ابدی ہے اور اس کی ابدیت میں اس کے شرکاء بھی غیر فانی ہیں۔ اس مضمون کی نسبت ہمارے خداوند کی تعلیم نہایت صاف ہے۔ بنی آدم کے لئے آئندہ حیات ضرور ہوگی۔ اس لئے کہ خدا اپنے تئیں ان کا باپ ٹھہراتا ہے وہ مُردوں کا خدا نہیں بلکہ زندوں کا ہے (مرقس ۱۲: ۲۷ نیز دیکھو متی ۲۲: ۳۱ وغیرہ لوقا ۲۰: ۳۷ وغیرہ) اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا بنی آدم کی خبر گیری کرتا ہے وہ ان سے محبت رکھتا ہے اور ان کا خدا ہے۔ اس لئے وہ ان کو برباد ہونے کے لئے ترک نہ کریگا رب عظیم اپنے فرزندوں کو کبھی ترک نہ کریگا*

(۴۷) اخلاقی صداقت کے دیگر کلمات کی شریعت۔ اس موقع پر اگر ہم ان طریقوں کا ذکر کریں جن سے فرائض کی بجا آوری کی تعلیم عموماً دی جاتی ہے۔ اور کہ ان کا ماحصل وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ تو ہمارے نفس مضمون کے سمجھنے کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اخلاقی تعلیم کا اول زینہ عموماً یہ ہوا کرتا ہے کہ قانون کی متابعت کرو۔ بچوں کو اسی طور پر سکھایا جاتا ہے۔ اسرائیل کو بھی اسی طرح تعلیم دی گئی تھی۔ ترقی کی منزل میں یہ وہ درجہ ہی جس میں سے ہر ایک شخص اور قوم کو گزرنا پڑتا ہی۔ مگر ہمارے خداوند نے یہ سکھایا کہ یہ محض ایک مرحلہ ہے۔ یہ کوئی آخری صداقت نہیں ہی ضروری ہی کہ شریعت محبت میں جذب ہوجائے سب سے اعلےٰ شریعت جس میں ہر قسم کے قوانین شامل ہیں محبت کی شریعت ہے مگر یہاں ہر ایک غلطی کا احتمال ہے۔ محبت محض کوئی ذہنی تریاس نہیں ہے۔ اُس کا وجود رُوحوں کی جماعت کے بغیر ناممکن ہے۔ جہاں کہیں اخلاقی

معنوں میں محبّت ہے وہاں کسی حد تک خدا کی بادشاہت بھی موجود ہوتی ہے (دیکھو رومیوں ۱۴: ۱۷) یہ بادشاہت روز عظیم تک تکمیل تک پہنچیگی مگر وہ اس وقت بھی جہاں کہیں رُوحیں ایک دوسرے کے ساتھ صحیح تعلق رکھتی ہیں دنیا میں موجود ہے۔ اسی خیال سے جب محبّت کے الفاظ کو مسیحی اخلاق کی زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ تو قانون محبّت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا دوسرا نام بادشاہت کے لئے زندگی بسر کرنا ہوتا ہے*

(۴۸) نورِ قلب۔ پھر یہ سکھایا جاتا ہے کہ نورِ قلب کی ہدایت کے مطابق چلو۔ اخلاقی حکم کو ادا کرنے کی یہ بھی ایک عام صورت ہے۔ نیکی اور راستی کی نسبت جب انسان کے دل کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ تو یہ خطاب فی الحقیقت کونشنس یا نورِ قلب کی طرف ہے۔ جب ہمارے خداوند نے فرمایا کہ پہلے خدا کی بادشاہت کی تلاش کرو تو اُس نے اپنے سامعین کی کونشنس کی طرف خطاب کیا۔ اس کونشنس کا اول قدم یہ ہے کہ وہ انسان کو اس امر کا قائل کرتی ہے کہ نیکی کو اپنا ہدف بنانا اور اُس فرض کو ادا کرنا چاہیئے جو بحیثیت روحانی مخلوق کے انسان کی سرشت سے متعلق ہے اس کے ذریعہ انسان محسوس کرتا ہے کہ میری زندگی میں اعلیٰ ترین قابلیّت کیا ہونی چاہیئے۔ عموماً اخلاقی مباحثہ میں کونشنس کی طرف سے زیادہ صفات منسوب کی جاتی ہیں۔ مثلاً کہا کرتے ہیں۔ کہ تمام اخلاقی مشکلات میں کونشنس کا فیصلہ ناطق ہے اور نیکی اور بدی کے درمیان امتیاز اسی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ کونشنس کے متعلق علم روح کو بعض اوقات علم اخلاق کا شیرازہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس وقت اُس مضمون پر طویل بحث کی گنجایش نہیں۔ فقط اسقدر جتا دینا کافی ہوگا کہ اگر کونشنس

کو آخری منصف قرار دیا جاوے تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ کس کی کونشنس کیونکہ ہر ایک کونشنس دوسری سے فرق رکھتی ہے تو کس کی کونشنس کو معیار قرار دیا جائے۔ اس سوال کا جواب ہمیشہ یہ دیا جاتا ہے۔ کہ دیگر انسانی قواء کی طرح کونشنس بھی اپنی کاملیت کے لئے تعلیم کی محتاج ہے ہر ایک شخص کی کونشنس کم و بیش ناقص ہے۔ مگر ہر ایک کونشنس ایک خاص نقشہ یا نمونہ کے رُخ جا رہی ہے اور وہی نقشہ اس کا معیار ہے یہ راست اور نہایت ضروری ہے مگر ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس سے معاملہ زیر بحث کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اگر کونشنس کو کاملیت کے لئے تعلیم درکار ہے تو آخری معیار کونشنس میں نہیں۔ بلکہ اس ذوالاختیار عامل میں ہے۔ جو اس کو تعلیم دیتا ہے اور یہ عامل خدا کی بادشاہت ہے۔ انسان فقط بحیثیت سوشل عالم کا ممبر ہونے کے اپنی کونشنس کو ضروری تعلیم دلا سکتا ہے۔ اور یہ سوشل عالم جسمیں انسان ایک درجہ رکھتا ہے۔ بادشاہت ایک جزوی تصوّر ہے کیونکہ اس سے اس کے شرکاء کی کوشش کو صحیح تعلیم حاصل ہو سکتی ہے *

(۹۴) آخری اخلاقی معیار۔ سچ تو یوں ہے کہ اخلاق کا آخری معیار کونشنس میں موجود نہیں۔ بلکہ اس اعلےٰ ہدف میں ہے جس کی طرف تمام نیک چلن کا رُخ ہے۔ یعنی کامل شدہ سوشل عالم یا محبّت کی بادشاہت یا خدا کی بادشاہت کا کمال۔ یہی وہ اعلےٰ تصوّر ہے جو اخلاقی عالم کے سارے نظام پر حکمران ہے اور جس کا اعلےٰ ترین قیاس اُس روز عظیم میں آشکارا ہوگا۔ المختصر ہماری تفتیش کا ماحصل یہ ہے کہ جب فرائض کے پیش کرنے کے دو عام طریقوں پر غور کی جاتی ہے تو وہ ہمارے خداوند کے اس

اصول میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کہ پہلے خدا کی بادشاہت کی تلاش کرو ✣

(۵۰) مسیحی کلیسیا اور بادشاہت۔ مندرجہ بالا بیان سے یہ خیال گذر سکتا ہے کہ بادشاہت کو حد سے زیادہ وسعت دی گئی ہے۔ بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ بادشاہت خاص مسیحی کلیسیا کا دوسرا نام ہونا چاہیئے۔ اور اس لئے اس کو محض ایک اخلاقی معراج یا نیک آدمیوں کی زندگی کا اخلاقی اصول یا محرک سمجھنا درست نہیں ہے۔ اس معاملے پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ اخلاقی اور کلیسیائی انتظام کا باہمی تعلق ایک نہایت وسیع مضمون ہے۔ جو ہمارے موجودہ نفس مضمون سے خارج ہے اگر اور کسی امر کا لحاظ نہ کیا جائے۔ تو فقط ساکرمینٹوں کے قائم کرنے ہی سے ظاہر ہے کہ ہمارے خداوند کا اپنی بادشاہت کو ایک باقاعدہ مذہبی ملّت بنانے کا مدّعا پیش نظر تھا۔ مگر یہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بادشاہت کو ایک اخلاقی معراج کی صورت میں پیش کیا علاوہ بریں ہمیں معلوم ہے کہ مسیح وہ نور ہے جو ہر ایک آدمی کو روشن کرتا ہے (یوحنا ۱: ۹) اور جہاں مسیح ہے وہاں بادشاہت کی جھلک بھی کچھ نہ کچھ نظر آتی ہے۔ اس کی نسبت یہاں پر اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ آخرالامر اخلاقی اور کلیسیائی تصوّرات یکرنگ ہو جاتے ہیں۔ یعنی مقررشدہ کلیسیا اور تمام انسانی سوسائٹی (جہاں تک اس کا اخلاق سے تعلق ہے) ایک ہی ہدف کے رُخ پر چل رہی ہیں۔ اور وہ ہدف خدا کی کامل بادشاہت یعنی محبت کی بادشاہت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے خداوند نے بادشاہت کے خیال کو کیسا اعلےٰ درجہ پر رکھا۔ اور وہ اس کو اخلاقی تعلیم پر کیسا فائق سمجھتا تھا ✣

(۵۰) جماعت - یہ واضح ہو گیا کہ جو اخلاقی تصور ہمارے خداوند نے پیش کیا وہ فی الحقیقت متعلق بہ سوسائٹی ہے - اور اب ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی یہ وجہ ہے کہ اس تصور میں جماعت بندی کا اصول پایا جاتا ہے - جماعت سے یہاں یہ مراد نہیں کہ اس کے تمام شرکاء کا مال و ملکیت مشترک ہو - اس قسم کا سوشل انتظام ابتدائی مسیحی کلیسیا میں قائم تو ہؤا تھا مگر جس مسئلے پر ہم اسوقت غور کر رہے ہیں - اسکا یہ ضروری حصل نہیں ہے - جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے سو یہ ہے کہ حقیقی بھلائی رفاہ عام ہے جو ہر ایک شخص اور سب کے لئے ایک ہی ہے یہ وہ ہدف ہے جسے ہر ایک شخص مدنظر رکھنا چاہیئے کسی کا حق نہیں کہ اَوروں کو خارج کر کے اپنا ہی فائدہ مدنظر رکھے سب برابر حقدار ہیں - بادشاہت ایک ایسا خاندان عظیم ہے - جس میں سب شرکاء خدا کی عام ابویت کے زیر سایہ مل کر بود و باش کرتے ہیں - ہر ایک ممبر کا فرض ہے کہ اپنی بھلائی کل کی اور ہر ایک شخص کی بھلائی سمجھے *

(۵۱) ہمارے خداوند کی تعلیم کا یہ اصول - ہمارے خداوند نے اس اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھا - اور اس کا اطلاق مختلف صورتوں میں کیا - چنانچہ اس سُنہلے قانون میں کہ جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں - تم بھی ان کے ساتھ وہی کرو - یہی اصول مُضمر ہے - یہی اصول اخلاقی طور پر اپنے آپ کو پرکھنے کے طریق میں پایا جاتا ہے - جس پر اُستاد عظیم نے بار بار زور دیا - مثلاً جب ہمارا خداوند عیب جوئی کی طبیعت کے خلاف متنبہ کرتا ہے تو وہ فرماتا ہے کہ اگر تم الزام لگاؤ گے تو تم پر بھی الزام لگایا جاویگا - اور پھر یہ سکھاتا ہے کہ جو لوگ عیب جوئی کی طبیعت اختیار کرتے ہیں وہ خود عیب جوئی کا ہدف بنتے ہیں (دیکھو متی ۷: ۱سے ۵) تو جو اپنے بھائی کے آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے - اپنی آنکھ کے شہتیر پر کیوں خیال نہیں کرتا - اے ریاکار

پہلے اپنی آنکھ میں سے شہتیر نکال۔ پھر اپنے بھائی کی آنکھ میں سے تنکے کو اچھی طرح دیکھ کر نکال سکیگا۔ اس سب تعلیم میں وہی اصول زیر غور رہ چلا جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ایسے وابستہ اور پیوستہ ہوئے ہیں کہ جو سلوک ہم اَوروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہی سلوک اُلٹا ہمارے اوپر کیا جاتا ہے۔ اگر ہم الزام لگائیں تو خدا اور انسان پر ہم الزام لگائیں گے اگر ہم ملامت کریں تو ہم بھی طعن و تشنیع کا ہدف بنینگے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھلائی کی طرح بدی بھی مشترک شئے ہے۔ اگر ہم عیب جوئی کریں تو ریا کار بن جائینگے۔ اس لئے کہ جیسے قصور اَوروں میں ہیں ہم میں بھی ہیں۔ اور ہم اپنے آپ کو علیحدہ کر کے اپنے کو اَوروں سے بدتر سمجھتے ہیں۔ اور یہ یاد نہیں رکھتے کہ ہم ان کی معاشرت کے شریک ہیں اور ان کے نقائص میں اُن کے ساتھی ہیں (دیکھو لوقا ۶: ۳۷ و ۳۸) اگر ہم اپنے پایہ کا صحیح تصوّر رکھیں تو اس سے فروتنی پیدا ہوگی۔ جس صفت کی خاصی خوبی انسان پر سب سے پہلے خداوند مسیح کی شخصیّت اور تعلیم میں ظاہر ہوئی ٭

دوسرا باب

پاک دل

(۱) باطن۔ خداوند نے فرمایا کہ مبارک وہ ہیں جو پاک دل ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کو دیکھینگے۔ جو خیال اس فقرہ میں ظاہر کیا گیا ہے وہ اخلاقی تعلیم کا ایک نہائت بنیادی اصول ہے۔ اس موقع پر پاک دلی کے لئے ایک جلیل وعدہ

کے ذریعہ اس کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے ہمارے خداوند نے اپنی تعلیم
کے کسی حصہ پر اس سے زیادہ زور نہیں دیا کہ نیکی دل کے اندر سے نکلنی
چاہیئے۔ اس کے نزدیک محض ظاہری اخلاق یا شریعت کے الفاظ کی پابندی
اور رسوم کی باقاعدہ تعمیل بغیر اندرونی نیکی کے کچھ وقعت نہ رکھتی تھی۔ فریسی
اپنی اخلاقی عادت کے لئے مشہور تھے۔ اگر کوئی شخص ان کے خیال کے
مطابق ظاہری طور پر شریعت کے الفاظ کی متابعت کرتا تھا تو بس کافی تھا
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فریسیوں میں ریاکاری بڑھ گئی وہ لوگ سفیدی پھری
ہوئی قبروں کی مانند ہو گئے جو اوپر سے تو خوب صورت دکھائی دیتی ہیں مگر
اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں (دیکھو متی
۲۳ باب) یہی وجہ تھی کہ مسیح نے فرمایا کہ اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور
فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں ہرگز
داخل نہ ہوگے ؂

(۲) انبیا اور فلسفہ کی تحریرات میں اس تعلیم کی نسبت
پیش بینی۔ جس صداقت پر ہمارے خداوند نے ایسا زور دیا وہ سراسر نئی
تعلیم نہ تھی۔ انبیائے عظیم اور زبور نویسوں نے اس کی جھلک دیکھی تھی۔ خصوصاً
یرمیاہ نبی نے ایک ایسے زمانے کی نسبت پیشین گوئی کی تھی جس میں خدا
اپنے لوگوں کے دل میں اپنی شریعت لکھے گا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ یہ وہ عہد
ہے جو اسرائیل کے گھرانے سے کرونگا۔ ان دنوں کے بعد خداوند فرماتا
ہے میں اپنی شریعت کو ان کے اندر رکھونگا اور ان کے دل پر اُسے لکھونگا
اور میں اُن کا خدا ہونگا اور وہ میرے لوگ ہونگے (یرمیاہ ۳۱: ۳۳) اور
زبور نویس نے بھی دُعا مانگی تھی کہ اے خدا میرے اندر پاک دل پیدا کر اور

ایک مستقیم روح میرے باطن میں نئے سر سے ڈال۔ بُت پرستوں کے درمیان
بھی ایسے شخص پیدا ہوئے تھے۔ جنہوں نے اندرونی اخلاقی حالت کی ضرورت
کو کچھ نہ کچھ محسوس کیا تھا۔ یونانی فلسفہ دانوں نے تعلیم دی تھی کہ ضرور ہے
کہ انسان اول کچھ بنے اور پھر کچھ کرے مگر ہمارے خداوند نے اس اصول
کو ایسے زور سے سکھایا اور موجودہ شریعت کے گہرے معنوں کی تہ تک
پہنچنے کی طاقت کو ایسی واضح طور پر ظاہر کیا کہ اس نے اخلاقی معراج کے
عام خیال کو بالکل اُلٹ دیا جو کچھ اب تک چند ملہم اشخاص یا خاص خاص
عالموں کا حصّہ تھا اس میں ساری دنیا کو شامل کر لیا ٭

(۳) بدی کا اندرونی مخرج۔ قابل لحاظ ہے کہ ہمارے خداوند نے
باطن کو نہ فقط نیکی بلکہ بدی کا مخرج بھی قرار دیا۔ یہودیوں کی رسوم متعلقہ طہارت
پر کام کرتے ہوئے اس نے فرمایا کہ جو چیز منہ میں جاتی ہے وہ تو آدمی کو
ناپاک نہیں کرتی (متی ۱۵: ۱۱) جو باتیں منہ سے نکلتی ہیں وہ دل سے نکلتی
ہیں۔ اور وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ کیونکہ بُرے خیال اور ہر قسم کے بد
اعمال دل ہی سے نکلتے ہیں (متی ۱۵: ۱۸ و ۱۹) پھر لوقا ۶ باب ۴۵۔ آیت
میں مندرج ہے کہ اچھا آدمی اپنے دل کے اچھے خزانے میں سے اچھی
چیزیں نکالتا ہے کیونکہ جو دل میں بھرا ہؤا ہے وہی مُنہ سے نکلتا ہے (نیز
دیکھو متی ۱۲: ۳۴ و ۳۵) ٭

(۴) شریعت کو گہرا کرنا۔ ہمارے خداوند نے قدیم شریعت کو منسوخ
نہیں کیا بلکہ اُسے پورا کیا وہ اس کے اندرونی معنی اور اُس کی تہ کی گہری
صداقت تک پہنچ گیا۔ اس نے یہ سکھایا کہ موسوی احکام کی پابندیوں کو توڑنے
کے بجائے میں انہی احکام کے عمیق معنوں کو ظاہر کرنے آیا ہوں وہ فقیہوں

اور فریسیوں کی راستبازی سے بڑھ کر راستبازی طلب کرتا تھا۔ جب ہم اپنے
خداوند کی خاص دینی تعلیم پر غور کرینگے تو اس وقت واضح ہوگا کہ مسیح کا ایسا
سخت قانون بھاری بوجھ نہ بنا جیسا کہ موسوی شریعت کو فقیہوں اور فریسیوں
نے اپنی تفسیر اور تشریح سے بنا دیا تھا (دیکھو متی ۲۳: ۴) ہمارا مدعا اسوقت
فقط یہ ہے کہ ان مثالوں کو پیش کریں جن سے اس نے ظاہر کیا کہ باطنی اصول
کیونکر ہر ایک حکم کو پورا کرتا ہے اور اس کی اندرونی سچائی کو ظاہر کرکے اسے
انسانی زندگی کو پرکھنے کا ایک اعلےٰ معیار قرار دیتا ہے۔ ان مثالوں سے
اس اصول کی تشریح اور توضیح ہوتی ہے علاوہ بریں ان کے ذریعہ انسان
کی کوشش خداوند کی تعلیم کی طاقت اور اخلاقی صداقت کی قایل اور معترف
ہو جاتی ہے اور ان سے ایسی تعلیم حاصل ہوتی ہے جس سے ہر شخص اس
اصول کا اطلاق خود بخود کر سکتا ہے*

(۵) مثالیں۔ چونکہ یہ رسالہ مسیح کی تعلیم کی تفسیر نہیں ہے اس لئے اُن
پانچ چھ مثالوں کا مشرح بیان نہیں ہو سکتا جو ہمارے خداوند نے اپنے
پہاڑی وعظ میں سُنائیں۔ اور جو متی کی انجیل کے پانچویں باب کی ۲۱ سے ۴۸
آیت تک مندرج ہے اول تو مثالیں لفظ بلفظ دس احکام میں سے لی
گئی ہیں یعنی وہ احکام جن میں خون اور ناپاکی منع ہے تیسری مثال دوسری سی مستنبط ہوتی ہے
ان ہیں یہودی قانون طلاق کا بیان ہے تیسری مثال پہلی اور دوسری کی نسبت دس احکام
سے کم تعلق رکھتی ہیں۔ مگر در اصل تیسرے حکم کی شرح ہے اس میں قسم
کھانے کے قانون پر بحث کی گئی ہے اور گفتگو میں سچائی اور سادگی کی
ہدایت کی گئی ہے پانچویں اور چھٹی مثالیں یہودی شریعت کے مسلمہ اصولوں
کے بارے میں تھیں اُن سے اوّل الذکر یعنی قانون انتقام کی طرف موسےٰ

کی کتابوں میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے اور چھٹی مثال یعنی دشمنوں کے ساتھ سلوک کرنے کے بارے میں جس قانون کا ذکر ہے وہ ایسی صورت میں ادا کیا گیا ہے جس کا ذکر کسی کتاب میں نہیں مگر یہودی مفسروں نے اس کی نسبت تعلیم دی تھی +

(۶) مثالوں کا مزید بیان۔ اول دو مثالوں سے بڑے زور سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہت میں شریعت کی متابعت اندرونی اور بیرونی دو طور پر ہونی چاہیئے۔ خون کی ممانعت کے بارے میں یوحنّا نے اپنے پہلے خط کے تیسرے باب کی پندرھویں آیت میں ہمارے خداوند کی تعلیم کو اس ایک فقرے میں ادا کر دیا ہے۔ کہ جو کوئی اپنے بھائی سے عداوت رکھتا ہے وہ خونی ہے علےٰ ہذا القیاس پاکیزگی کے قانون کی طرف اسی قسم کا اشارہ ہے باقی مثالوں میں ہمارا خداوند شرع کی متعدد تعلیمات کو نظر انداز کر کے اس کے اندرونے تہ تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ قسم کا سراغ اسکی جڑ تک لگاتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت سے بہتر انتقام ہو سکتا ہے اور محبّت کی لامحدودی کو ظاہر کرتا ہے اس طور پر ہمارا خداوند شریعت کو گہرا بنا دیتا ہے اور ایسے اعلےٰ قوانین یا اصولوں تک پہنچ جاتا ہے جن سے ہمیں قانون زندگی کے اطلاق میں ہدایت اور مدد ملتی ہے +

(۷) خواہش۔ دل کی پاکیزگی کا اصول اکثر مشکل معلوم ہوتا ہے کیا دل میں بُری خواہش یا بدخیال کی موجودگی بذات خود گُناہ ہے۔ اس کا جواب ضرور نفی میں ہونا چاہیئے۔ اگر بُرا خیال یا خواہش کی طاقت محسوس نہ کی جائے امتحان فی الحقیقت شروع نہیں ہوتا امتحان

امتحان کے لئے خواہش کا ہونا ضرور ہے کیونکہ اگر دل کے اندر متاثر ہونے کا مادہ نہ ہو تو امتحان کا اثر کس پر پڑیگا مگر جب تک خواہش کے آگے سر تسلیم خم نہ کیا جاوے گناہ شروع نہیں ہوتا لوگ اکثر بھول جاتے ہیں کہ بغیر بیرونی عمل کے خواہش کا اسیر ہو جانا ممکن ہے۔ چنانچہ خواہش کا اسیر ہو جانا ممکن ہے۔ چنانچہ خواہش دل کو قابو کر لیتی ہے اور دل کے اندر بڑی خاطر اور مدارات سے اس کی ناز برداری کی جاتی ہے۔ گو اس کے نتائج یا جسمانی مشکلات کے خوف کے مارے عملی طور پر اس کا ظہور نہ ہو اس حالت میں خواہش کی متابعت گناہ ہے در اصل تمام گناہ کی یہی بنیاد ہے۔ کیونکہ جب نتائج کا خوف جاتا رہے یا جسمانی مشکلات باقی نہ رہیں بدعمل ضرور سرزد ہوگا۔ غرض گو بُری خواہش کی موجودگی بذات خود گناہ نہ ہو تو بھی بدخیالی کی متابعت گناہ ہے۔ خواہ بدعملی اس سے فوراً پیدا نہ ہو۔

(۸) نیک ارادہ۔ مندرجہ بالا بیان سے ہم یہ ظاہر کرتے ہیں کہ نیکی اور بدی بیرونی چال وچلن کی نسبت زیادہ تر دل کی حالت پر موقوف ہے یہی وہ مسئلہ ہے جس کو زمانہ حال کے علم الاخلاق میں یوں ادا کیا جاتا ہے کہ معاشرت کی نیکی اور بدی مدعا پر منحصر ہے۔ ملک جرمنی کے فلاسفر کانٹ نے اسی صداقت کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا کہ دنیا میں اور دُنیا سے باہر سوائے نیک ارادے کے کسی اَور نیکی کا قیاس ہی ناممکن ہے یہاں ارادے سے مراد ہے دل کی ایسی اخلاقی حالت جو قدرتی طور پر فعل میں نمودار ہوتی ہے یا یوں کہو کہ یہ اخلاقی مخلوق کا ایک عزم ہے جو کسی خاص مقصد کے رُخ ہوتا ہے۔ یہ محض احساس یا خواہش نہیں ہے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جب ہمارے دل میں نیک محسوسات یا اچھے

خیالات موجود ہوں تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے۔ مگر یہ سراسر غلطی ہے۔ کیونکہ جب تک احساس یا خواہش ارادہ کی صورت میں تبدیل پذیر نہ ہو کر اس کو نیک ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ ہمارا خداوند اگرچہ دلی حالت پر اس قدر زور دیتا ہے تو بھی نیک عمل کو موسوی شریعت کی نسبت کم ضروری نہیں سمجھتا پہاڑی وعظ کا آخری سبق اسی صداقت کی نسبت ہے۔ نہ ہر ایک جو مجھے خداوند خداوند کہتا ہے آسمان کی بادشاہت میں داخل ہوگا بلکہ وہی جو میرے باپ کی جو آسمان میں ہے مرضی پر چلتا ہے اور آخر کار ایک نہائت موثر تمثیل میں سامعین کو اسکی نسبت متنبہ کرتا ہے (متی ۷: ۲۴ سے ۲۷)۔

(۹) نیت اور چال وچلن۔ پس نیک و بد چال وچلن کی اخلاقی صفت نیت پر موقوف ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ضرور ہے کہ ارادہ کی ماہیت اور نیت اور فعل کے باہمی تعلق پر کچھ مزید غور کی جائے ہر ایک فعل یا فعل کے میلان میں فاعل کا کچھ مدعا ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنے فعل سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے فعل کا کوئی خاص ہدف ہوتا ہے فاعل اپنے مدعا کے رُخ پر چلنے کا قصد کرتا ہے اور یہ قصد ارادہ کا کام ہے اب فاعل اپنے مدعا کو حاصل کر کے محظوظ ہونا چاہتا ہے۔ اور اس حظ کو حاصل کرنے کے لئے اپنے ارادہ کو ایک خاص طریق پر تحریک دیتا ہے اس موقع پر نیت کا آغاز ہوتا ہے یہی انسان کو کسی فعل کے کرنے کے لئے حرکت دیتی یا مجبور کرتی ہے اس لئے اس کی ماہیت بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔ فی الحقیقت جس بات کو انسان اپنا مدعا ٹھہراتا ہے وہی اس کی نیت ہے۔ جو امر انسان کو فعل پر آمادہ کرتا ہے

وہ ایک ایسی بات ہے جس پر غور کرتے ہی انسان اس کو حاصل کرنے کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے۔ غرض اس بات کا خیال یا یوں کہو کہ اس بات کا تصوّر جس سے اس کو خوشی حاصل ہو سکتی ہے درحقیقت نیت ہے*

(۱۰) محسوسات۔ اکثر اوقات لوگ محسوسات اور مدعا میں فرق نہیں کرتے وجہ اس کی یہ ہے کہ جب انسان کسی مدعا کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اُس کی نسبت کم و بیش تصوّر یا احساس رکھتا ہے۔ بعض اوقات یہ تصوّر اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ انسان سب کچھ بھول جاتا ہے دراصل یہ اندرونی احساس یا تصوّر بہت کچھ نیّت میں شامل ہوتا ہے مگر یہ نیت کا حقیقی جوہر نہیں یہ تصوّر نیت کا خاصہ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات جب انسان اپنے مدّعا کو حاصل کر لیتا ہے تو اس کو بہت سی خوشی حاصل ہوتی ہے اس لئے یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ مقاصد کو اکثر تصوّرات کے الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔ مگر نہایت خوش بخوش اور اعلےٰ درجہ کے محسوسات بھی معاملات کی جڑ تک نہیں پہنچ سکتے وہ سورج کی کرنوں کی مانند ہیں جو نہایت خوبی کے ساتھ زمین پر چمکتی ہیں مگر بغیر تختہ ارض کے ان کی خوبصورتی ظاہر نہیں ہو سکتی*

(۱۱) محبّت بطور نیت۔ اکثر بیان کیا جاتا ہے کہ محبّت مسیحیت ہے اور یہ بالکل صحیح اور راستی کا ایک نہایت ضروری اظہار ہے۔ محبّت خاص طور پر دل کے ساتھ ہم کلام ہوتی ہے۔ مگر یہاں محبّت محض ذہنی کیفیت یا جذبہ سے بڑھ کر ہے۔ جذبہ ایک نور کی کرن ہے اور جس زمین پر وہ پڑتی ہے وہ خدا اور انسانی رُوحوں کا باہمی تعلّق ہے۔ مسیحی معنی میں محبّت الٰہی خاندان میں رہتی ہے یعنی وہ خاندان جس کا باپ خدا ہے۔ ہم مسیحی نیت

کا ایک اَور صورت میں بیان کر چکے ہیں اس کو اصول کی صورت میں ادا کیا گیا ہے کہ پہلے خدا کی بادشاہت کی تلاش کرو۔ جو قانون اسوقت زیر بحث ہے اس کو اس طور پر ادا کر سکتے ہیں کہ محبّت سے زندگی بسر کرو یہ دونوں اصول ایک ہی صداقت کے ظاہر کرنے کے دو مختلف طریقے ہیں۔ وہ ایک ہی بڑے بھاری حقیقی مدعا کے دو مختلف پہلو ہیں ایک خارجی پہلو ہے اور دوسرا داخلی۔ ایک میں یہ کہا گیا ہے کہ محبّت کی بادشاہت کی تلاش کرو اور دوسرے میں کہ محبّت کو پھیلنے دو تو بادشاہت آجائیگی۔ دونوں کا ماحصل اور مدعا ایک ہی ہے کیونکہ جہاں محبت فی الحقیقت پھیلتی ہے وہ انسانوں کو خدا کی محبّت کے اختیار میں لے آتی ہے اور اس طور پر بادشاہت کو قائم کرنے میں مدد دیتی ہے اسی وجہ سے ہمارا خداوند ہر قسم کے مقاصد کو جن کا ہدف نیکی ہوتا ہے محبّت کے اعلےٰ اصول میں شامل کرتا ہے وہ سکھاتا ہے کہ اگر ہم خدا سے اور اپنے بھائی سے محبّت رکھیں تو ہم نے سب حکموں کو پورا کر لیا +

(۱۲) معافی۔ اب ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ کیسے عجیب طور پر ہمارے خداوند نے ہمیں اپنے قصور والوں کو معاف کرنے کی تعلیم دی ایک رسُول نے دریافت کیا کہ اے خداوند اگر میرا بھائی گناہ کرتا رہے تو میں کتنی دفعہ اُسے معاف کروں۔ کیا سات دفعہ تک یسُوع نے اس سے کہا میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ سات دفعہ بلکہ سات دفعہ کے سترّ گُنے تک۔ اصول محبّت کا یہی بے حد الہٰی اطلاق قانونِ انتظام (متی ۵: ۳۸ سے ۴۲) اور دشمنوں کے متعلّق قانون (متی ۵: ۴۳ سے ۴۸) میں پایا جاتا ہے ایک میں ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ بدی پر نیکی سے غالب آنا

چاہیئے یعنی مخالف سے ایسی محبّت رکھنی چاہیئے کہ وہ مہربانی کا سلوک دیکھ کر خود ہی شرمندہ ہو جائے۔ دوسرے میں اب اعظم کی مثال پیش کی گئی ہے تاکہ اعلےٰ ترین محبّت کی ماہیّت ظاہر کی جائے۔ یعنی ایسی محبّت جو نیکوں اور بدوں اور راستوں اور ناراستوں کو یکساں لطف و کرم کی نگاہ سے دیکھتی ہے قصوروں کی معافی کی از حد ضرورت پر خداوند نے ایک عجیب طور پر زور دیا اس نے بار بار یہ تعلیم دی کہ جو لوگ اپنے ہمجنس بھائیوں کو معاف نہیں کرتے۔ وہ رب العالمین سے معافی حاصل کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ چنانچہ متی ۶: ۵ میں لکھا ہے کہ اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کروگے تو تمہارا باپ بھی تمہارے قصور معاف نہیں کریگا یہی سبق اَور بھی زیادہ زور کے ساتھ اس نوکر کی تمثیل میں سُنایا گیا ہے جو اَوروں کو معاف نہیں کرتا تھا (دیکھو متی ۱۸: ۲۳ سے ۳۵ نیز مرقس ۱۱: ۲۵ و ۲۶) بلاریب اس کی یہی وجہ ہے کہ معافی دلی محبّت کا اظہار ہونا چاہیئے اس کا چشمہ محبّت اور ہدف بھی محبت ہی ہونا چاہیئے وہ باوشاہت کی تلاش کرتی ہے اس لئے جہاں اس کی نفی ہے مثلاً اس نامعاف کرنے والے نوکر کی تمثیل میں جہاں عدم معافی یا خودغرضی کی روح پائی جاتی ہے وہ موجود نہیں ہوسکتی +

(۱۳) اپنے دشمنوں کو پیار کرو۔ اکثر اوقات اس حکم کی نسبت یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس میں انسان سے اس کی طاقت سے کچھ بڑھ کر طلب کیا گیا ہے۔ بہت لوگ اس کو ایک نامکمل التعمیل حکم سمجھتے ہیں مگر یہ غلطی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم محبّت کا ایک ناکامل تصور دل میں بنا لیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں محبّت زیادہ تر محض ایک ولولے یا

دلی جوش کا نام ہے۔ محبّت میں ولولے تو ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ اس کی اصلی ذات نہیں ہیں اور نہ اُن کی شدّت محبّت کی حقیقت کا معیار ہے۔ اپنے موجودہ مدعا کے لحاظ سے ہم محبّت کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ یہ ہے اپنے تئیں خدا کو اور اپنے ابنائے جنس کو دے دینا اس کی ہستی کو ثابت کرنے کے لئے دریافت کرنا ہے چاہیئے کہ وہ اَوروں کے لئے کیا کرتی ہے۔ وہ کیا دیتی ہے یا دوسروں کی خاطر کیا کچھ برداشت کرتی ہے وہ خود انکاری کرتی ہے تاکہ اَوروں پر فضل و رحمت ہو یہ ضرور نہیں کہ جن کو وہ بہت کچھ دینے کے لئے تیار ہے ان کے لئے وہ جوش و الفت کا دم بھرے اس کی حقیقت کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ وہ کیا دیتی ہے نہ کہ وہ کیا محسوس کرتی ہے جو محبّت دشمنوں کے لئے ہے وہ یقیناً اسی قسم کی ہوگی۔ یہ بیان ہمارے خداوند کی پہاڑی وعظ کی اس تعلیم کے عین مطابق ہے جس میں اُس نے فرمایا کہ اپنے دشمنوں سے محبّت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دُعا مانگو۔ تاکہ اپنے آسمانی باپ کے بیٹے ٹھیرو۔ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے۔ اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے۔ اسی مقام میں خدا کی محبّت اس کی عنایات سے ثابت ہوتی ہے اور اس سے یقیناً یہی سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہمیں بھی اپنے دشمنوں سے اسی قسم کی محبّت رکھنی چاہیئے۔ جیسی خدا رکھتا ہے۔ یعنی ایسی محبّت جو حسب موقع اور وہ چیزیں دینے کو تیار ہو جن کی ضرورت ہے یا جن سے ہمارے دشمنوں کو فی الحقیقت برکت حاصل ہو سکتی ہے ٭

تیسرا باب

اعلیٰ نمونہ

(۱) اخلاقی معراج کے دو پہلو۔ اخلاقی معراج چال وچلن یا سیرت کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ اور یہ اس امر پر موقوف ہے کہ ہم اس پر اندرونی یا بیرونی جانب سے غور کرتے ہیں۔ چال وچلن کے معراج کا بیان پہلے باب میں ہو چکا ہے ہمارے چال چلن کا ہدف ہمیشہ بادشاہت ہونا چاہیئے۔ ہمیں بادشاہت کے لئے ہی زندگی بسر کرنا ہے اسی اعلےٰ سوشل تصوّر کو مدنظر رکھ کر ہمیں سب کام کرنے میں ہمارا خداوند سیرت کا اعلیٰ ترین تصوّر بھی بڑی صفائی سے ہمارے پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کی رو سے اخلاقی زندگی سے مراد ہے ایسی زندگی جو بادشاہت کی تلاش کرتی ہے یا جو ایک خاص قسم کی سیرت عامل میں پیدا کرتی ہے ہمیں نہ فقط اُس اعلےٰ مدعا کا خیال رکھنا ہے مگر اس بات کا بھی کہ ہمیں خود کیا بننا ہے۔ کیونکہ ہمیں نہ فقط کچھ کرنا ہے بلکہ کچھ بننا بھی ضرور ہے ؛

(۲) ہر دو تصوّرات کا تعلّق۔ ابھی بیان کیا گیا ہے کہ فی الحقیقت ایک ہی تصوّر دو مختلف پہلوؤں سے چال وچلن یا سیرت کی صورت میں نظر آتا ہے کیونکہ آخرالامر یہ دونوں ایک ہی بن جاتے ہیں۔ یہ بیان شاید کسی قدر توضیح کا محتاج ہے۔ جب بادشاہت کو چال وچلن کا اعلےٰ ترین تصوّر کہا جاتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمیں کسی نہایت دُور دراز

الٰہی سلطنت کو جو موجودہ حالات کے ساتھ کچھ تعلّق نہیں رکھتی اپنا ہدف بنانا ہے اس دور افتادہ بادشاہت کا کامل تصوّر ہی فی الحقیقت معراج ہے در اصل وہی آخری منزل ہے مگر اس کا تصوّر کم و بیش ہر ایک عمل میں پایا جاتا ہے ایک معنی میں خدا کی بادشاہت وہیں ہے جہاں انسان کی زندگی میں خدا کی رُوح اپنا اثر دکھاتی ہے۔ خدا کی بادشاہت ہمارے بیچ میں ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ ایک الٰہی تجویز ہے جو اس وقت بھی مخلوقات کے تمام کارخانہ پر مسلّط ہے اور دوسری جانب وہ فی الحقیقت خواہ ناکامل طور پر ہی ہو ہماری اس دنیا کی سوشل اور دینی زندگی میں بھی پائی جاتی ہے اب جوں جوں انسان اپنی موجودہ حالت میں اس بادشاہت کا جزوی تصوّر باندھ سکتا ہے اسی قدر اس شخص میں نیک سیرت کا مادہ بھی موجود ہوگا ہر ایک رُوح بیں ہستی کی ایک اندرونی حالت ہے جو اَوروں کے ساتھ بیرونی تعلّق رکھتے ہیں مطابقت رکھتی ہے۔ اور ہر ایک شخص میں اس بادشاہت کا تصوّر جس درجہ پر ہوگا اس کا اندازہ اندرونی حالت اور بیرونی تعلّق دونوں سے ہو سکتا ہے۔ اور جس طرح یہ بادشاہت سوشل حالت کو زیادہ زیادہ اس اعلےٰ نقشہ کے مطابق بنانے سے آتی ہے۔ اسی طرح ہر ایک رُوح میں سیرت کی حالت کو سیرت کے اس اعلےٰ ترین تصوّر کے مطابق بنانے سے بھی آتی ہے ؞

(۳) سیرت کا اعلےٰ ترین تصوّر۔ ہمارے خداوند نے خود اپنے ربّ عظیم کو سیرت کا اعلےٰ ترین نمونہ صاف طور پر ٹھیرایا۔ مسیح نے جو لفظ باپ پر زور دیا اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس صداقت کو کیسی وضاحت کے ساتھ پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ فرماتا ہے کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو

اور اپنے ستانے والوں کے لئے دُعا مانگو تا کہ تم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے ٹھیرو۔ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے (متی ۵: ۴۴ و ۴۵) اس کی تعلیم یہ ہے کہ تم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے بنو اور خدا کی مانند ہو جاؤ اسی اعلیٰ ترین تصوّر کا بیان اٹھتالیسویں آیت میں اور بھی زیادہ واضح طور پر کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے کہ تم کامل بنو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے۔ اس مقام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ اعلےٰ ترین تصوّر ہے جس کو بطور نمونہ کے ہمیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر ایک مسیحی سیرت میں خدا کی کاملیّت کو معلوم کرنا ناممکن ہے۔ اس حکم کا مدّعا فی الحقیقت یہ ہے کہ وہ کاملیت بطور معیار کے ہمیشہ تمہارے سامنے رہے۔ کسی ادنےٰ ہدف سے تمہاری تسلّی ہونی چاہیئے اس گوشت اور خون کے پتلے سے کاملیت کی توقع رکھنا اس کی بساط سے بڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔ گنہگار انسان کو یہ کہنا کہ خدا کی مانند کامل بنو ایک لایعنی حکم معلوم ہوتا ہے کیونکہ انسان انسان ہی ہے مگر بنی آدم میں نیک سیرت کا موجود ہونا ہی خدا کا نمونہ یا نقش ہے۔ سیرت کی خوبی ہمیشہ اسی میں ہے کہ وہ خدا کی تقلید پر رہو۔ خواہ ان میں بہت دور دراز فاصلہ ہو۔ جب ہمارے خداوند کی اس تعلیم سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ اس مقام میں کامل سیرت کا اعلیٰ ترین تصوّر پیش کر رہا ہے تو تمام مشکل رفع ہو جاتی ہے +

(۴) اعلےٰ ترین تصوّر کا تجسّم۔ پس خدا سیرت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ مگر اس اعلےٰ نمونہ خواہ اس کو قطعی صداقت بھی مان لیا جائے۔ بہتوں کے نزدیک روزمرّہ کے کاروبار میں کماحقہٗ کار آمد نہیں ہو سکتا۔ یہ سچ ہے

کہ ہمارا خداوند اپنے نمونہ سے اس اصول کے اطلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ باوجود اس نمونہ کے کہ اگر ہمارا دارو مدار فقط تعلیم ہی پر ہو تو سیرت کا وہ اعلےٰ ہدف ایسا بعید اور وسیع اور ایسا لایعنی معلوم ہوگا جو ہماری روزمرّہ کی ضروریات میں بآسانی کارآمد نہیں ہوسکتا یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ مسیح کی اخلاقی تعلیم کا یہ خاص پہلو اس کی زندگی میں ویسا ہی پایا جاتا ہے جیسا کہ اس کی تعلیم میں یا شاید اس سے کچھ بڑھ کر اس نے سیرت کے اعلےٰ تصوّر کو نہ فقط الفاظ میں پیش کیا بلکہ اس کو ایک ایسی حقیقت کے طور پر ہمارے سامنے رکھ دیا جس کو ہم محسوس کرسکتے ہیں وہ خود ہی مجسم اعلےٰ تصوّر ہے۔ دنیا پر ہمارے خداوند کی زندگی اور موت کا اخلاقی اثر بیان سے باہر ہے اس نے اپنی ذات میں انسانی سیرت کو اعلےٰ پایہ تک سرفراز کیا اسنے انسان پر ایک ایسی اخلاقی خوب صورتی کو منکشف کیا جو خواہ بہر پہلو نئی صورت نہ رکھتی تھی تو بھی کم از کم ایک ایسی نئی طرز پر ظاہر کی گئی جو فی الحقیقت انکشاف کے درجہ تک پہنچ جاتی تھی سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ اُس نے اپنی ذات میں اس تعلیم کی اخلاقی صداقت کو ایسا ظاہر کیا کہ محبّت کو اعلیٰ معراج تک پہنچا دیا ہے اس نے دُنیا کو وہ کچھ دکھایا جو اُس نے پیشتر یقیناً کبھی نہ دیکھا تھا یعنی یہ کہ محبّت اعلےٰ ترین اور سب سے زیادہ خدا کی مانند اس وقت ہوسکتی ہے جب وہ اپنے آپ کو سب سے پست کردیتی ہے اس نے زمین و آسمان کے روبرو عبرانیوں کے خط کے مصنف کے اس گہرے خیال کی صداقت کو ظاہر کردکھایا کہ اس کو یہی مناسب تھا کہ جب بہت سے بیٹوں کو جلال میں داخل کرے تو ان کی نجات کے بانی کو دکھوں کے ذریعے سے کامل کرے (عبرانیوں ۲: ۱۰)

اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ جب پولوس مسیح کے نمونے کے عمل کا ذکر کرتا ہے تو وہ محبت کے اس خاص پہلو پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے کہ ویسا ہی مزاج رکھو جیسا یسوع مسیح کا تھا جس نے خدا کی صورت پر ہو کر خدا کے برابر رہنے کو قبضہ میں رکھنے کی چیز نہ سمجھا بلکہ اپنے آپ کو خالی کر دیا اور خادم کی صورت اختیار کی اور انسانوں کے مشابہ ہو گیا اور انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی (فلپیوں ۲: ۵ سے ۸) ہمارے خداوند نے نہ فقط اپنے آپ کو بادشاہ اور نجات دینے والا ٹھیرایا بلکہ اُس نے اپنے تئیں نمونہ قرار کر دیا۔ اُس دعوت عظیم میں اُس نے فرمایا میرا جوا اپنے اوپر اُٹھا لو اور مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن تو تمہاری جانیں آرام پائینگی (متی ۱۱: ۲۹) پھر یوحنا ۱۳: ۱۵ میں یوں لکھا ہے کہ میں نے تم کو ایک نظیر دکھائی ہے کہ جیسا میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے تم بھی کرو۔ نیز یوحنا ۱۵: ۱۲ میں وہ فرماتا ہے کہ میرا حکم یہ ہے کہ جیسے میں نے تم سے محبت رکھی تم بھی ایک دوسرے سے محبت رکھو (نیز دیکھو یوحنا ۱۳: ۳۴ و ۳۵) *

(۵) مسیح کے نمونے سے کیا تبدیلی واقع ہوئی۔ ہمارے خداوند کی تعلیم اور نمونہ نے اعلےٰ ترین سیرت کے عام تصوّر میں جو بھاری تبدیلی پیدا کر دکھائی اس کو کما حقہ سمجھنا نہایت دشوار ہے مسیحی تواریخ کی اتنی بہت سی صدیوں کے پیچھے ہمیں اپنے خیالات میں مسیحی زمانہ سے پیشتر کے خیالات تک پہنچنا ناممکن ہے اور یہ مشکل اس امر کے لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کہ ہمارے عمل کی نسبت ہمارے

اعلےٰ تصوّرات بہت ہی ترقی کر گئے ہیں۔ ہمارے خداوند نے کیا تبدیلی پیدا کر دی۔ اس کا خیال خوب جمانے کے لئے ضرور ہے کہ کسی قدیم زمانہ کے اُستاد کے اعلےٰ ترین تصوّر کو یسوع مسیح کے تصوّر کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ خوش قسمتی سے دُنیا کے ایک بڑے بھاری اُستاد کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تصویر اس وقت موجود ہے۔ ارسطو اپنے رسالہ علم الاخلاق میں بڑے اعلیٰ انسان کی تصویر نہایت عجیب طور پر کھینچتا ہے۔ ایسے شخص میں بُت پرست یونان کی نیکی اور اعلےٰ درجہ کی مگر ناکامل شرافت تو پائی جاتی ہے مگر ساتھ ہی وہ شخص مغرور۔ خود پسند اور متکبّر بھی ہے۔ اس کی جس عظمت کا بیان ارسطو نے کیا ہے وہ ہمارے خداوند یسوع مسیح کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ اس میں نہ تو ارسطو کا قصور تھا اور نہ اس تہذیب کا جس کا وہ وکیل تھا۔ مسیح کی آمد سے پیشتر دنیا حقیقی عظمت سے واقف نہ تھی جیسی کہ وہ اب ہے ہمارے خداوند نے حقیقی اعلیٰ تصوّر انسان کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیا یا اُس نے ایک زندہ حقیقت بنا کر دکھا دی +

(۶) اس اعلےٰ تصور کا عملی اطلاق۔ متی کے پانچویں باب کی تینتالیس سے اٹھتالیس آیات میں اس مسئلہ کا نہائت صاف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ خدا خود ہی سیرت کا اعلیٰ ترین تصوّر ہے۔ اس مقام میں ایک خاص مشکل کو حل کرنے کے لئے اسی اصول کا اطلاق کر کے دکھایا ہے وہ مشکل یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔ قدیم زمانہ میں یہ ایک مسلّمہ قاعدہ تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت اور اپنے دشمن سے عداوت رکھنی چاہیئے۔ انسان کے لئے اور خصوصاً یہودیوں کے لئے جن کو اپنے چیدہ قوم ہونے پر ناز تھا اس قاعدے

کے سوائے کسی اَور پر عمل کرنا دشوار تھا مگر مسیح نے سکھایا کہ اس مشکل کا حل نہ تو تعصّب یا جوش سے اور نہ قدیم قانون یا رسوم سے بلکہ سیرت کے حقیقی معیار کو مدّ نظر رکھ کر کرنا چاہیئے۔ دیکھو خدا کی محبّت کیسی لامحدود اور بے تعصّب ہے۔ وہ اپنی عنایات نیکوں اور بدوں۔ اپنے مخالفوں اور محبّت کرنے والوں دونوں پر یکساں رکھتا ہے۔ وہ ناشکروں اور بدوں پر مہربان ہے (لوقا ۶: ۳۵) اس طور پر ہمارا خداوند اس مقام میں نہ فقط ایک خاص مشکل کو حل کرتا ہے بلکہ ایک ایسا اصول قائم کرتا ہے اور ایک ایسے طریق کی تعلیم دیتا ہے جس سے اس قسم کے تمام سوالات حل ہو جائیں۔ یہ اصول اور طریقہ دونوں لفظ محبّت میں ادا ہو سکتے ہیں یہی وہ صداقت ہے جس کو مقدّس یوحنّا نے نہائت مؤثر طور پر سکھایا۔ اور فرماتا ہے عزیزو آؤ ہم ایک دوسرے سے محبّت رکھیں۔ کیونکہ محبّت خدا کی طرف سے ہے اور جو کوئی محبّت رکھتا ہے۔ وہ خدا سے پیدا ہؤا ہے اور خدا کو پہچانتا ہے۔ جو محبّت نہیں رکھتا وہ خدا کو نہیں پہچانتا۔ کیونکہ خدا محبّت ہے (۱ یوحنّا ۴: ۷ و ۸)۔

(۷) محبت کے اصول کا مرکزی درجہ۔ مسیح کی اخلاقی تعلیم میں محبّت کا اصول نہائت مرکزی درجہ رکھتا ہے۔ وہ اس تعلیم کے تمام اجزا کو پیوستہ کرنے کا ایک بندھن ہے۔ جس سے تمام تعلیم میں ایک خوش اندازہ موافقت پائی جاتی ہے اعلےٰ اخلاق تصوّر کے بیرونی پہلو پر غور کرتے ہوئے ہم بادشاہت کے اعلےٰ تصوّر تک پہنچ گئے تھے اور ہم نے معلوم کیا کہ وہ بادشاہت محبّت کی بادشاہت ہونی چاہیئے۔ جس میں ہر ایک شخص اَوروں کے لئے برکت کا باعث ہوتا ہے اور اس طور پر

خود بھی برکت پاتا ہے۔ جب ہم نے۔ بیرونی پہلو سے اندر کی طرف رجُوع کیا اور بادشاہ کے شرکاء کی نیت اور سیرت پر غور کی تو ہم نے یہ دیکھا کہ ان دونوں کو محبّت کے لفظ سے ادا کر سکتے ہیں۔ جو چال وچلن بادشاہت کی خاطر ہے۔ وہ بعینہ وہی چال وچلن ہے جس کا مدعا محبّت ہے۔ اگر ان میں کچھ اختلاف معلوم ہو تو ارادہ کے اندر ضرور کوئی کل بگڑی ہوئی ہوگی۔ اُس کا رُخ فی الحقیقت بادشاہت کی طرف نہیں بلکہ بادشاہت کے کسی ناکامل تصوّر یا کسی اور بالکل مختلف مدعا کی طرف ہوگا۔ سیرت کی نسبت ہم نے ابھی دیکھا ہے۔ کہ خدا یا یوں کہو کہ خدا جو مسیح میں ظاہر ہو وہ اعلےٰ نمونہ ہے جس کی طرف نیک سیرت کو ہمیشہ بڑھتے جانا چاہیئے اس امر کی نسبت ہمارا خداوند ہمارے سامنے اعلےٰ تصوّر رکھتے ہوئے اُس تصوّر کے حاصل کردہ اصول کا ایسا اطلاق پیش کرتا ہے کہ جس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ محبّت سیرت کا اعلےٰ ترین خاصہ ہونا چاہیئے مزید برآں ہمارا خداوند اخلاقی احکام کا خلاصہ محبّت کو ٹھیراتا ہے یعنی محبّت خدا سے اور انسان سے۔ غرض محبّت کا اصول ہی وہ بندھن ہے جو ہمارے خداوند کے اخلاقی تعلیم کے تمام حصوں کو باندھ لیتا ہے۔ جیسی کائنات میں اس کی منزلت ہے ویسی ہی اس کی اخلاقی قیمت بھی ہے۔ ہمیں سکھایا گیا ہے کہ محبّت سب سے اعلیٰ پایہ پر ہے کیونکہ خدا محبّت ہے *

(۸) میرا پڑوسی کون ھے۔ مندرجہ بالا بحث سے ہمارے خداوند کی اخلاقی تعلیم کا ایک خاص جزو غورطلب پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ محبت کا دائرہ کس قدر وسیع ہونا چاہیئے۔ یا اُس سوال کو اس صورت میں پیش

کر سکتے ہیں۔ جو ہمارے خداوند سے پوچھا گیا تھا کہ میرا پڑوسی کون ہے
اگر ہمیں اپنے پڑوسی کو اسی قدر پیار کرنا ضرور ہے جیسا ہم اپنے آپ کو
کرتے ہیں تو اس سے یہ ایک نہائت سنجیدہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس
اصول کو کس قدر وسعت دی جاوے۔ اس کا جواب ہم اوپر دے چکے
ہیں وہ متی کی انجیل کے پانچویں باب کی تینتالیسویں سے اڑتالیسویں
آیات میں مندرج ہے۔ اور ہم اس پر مفصل بحث کر چکے ہیں۔ ضرور ہے کہ
ہماری محبّت خدا کی محبّت کی مانند ہو۔ بدوں اور نیکوں راستبازوں اور
ناراستوں سب کے لئے یکساں برکت کا باعث ہو۔ یہ جواب زیادہ صفائی
کے ساتھ اس تمثیل میں پایا جاتا ہے جو ہمارے خداوند نے ایک شریعت
سکھانے والے کے سوال کے جواب میں سنائی تھی۔ نیک سامری کی تمثیل
سے یہ تعلیم حاصل ہوتی ہے کہ سب آدمیوں کا کچھ نہ کچھ حق ہم پر ہے اس
سبق کو ذہن نشین کرنے کی خاطر مسیح نے اپنی تعلیم میں ایک ایسے شخص
کو منتخب کیا جو یہودیوں کے سامنے ایک حقیر اور راندہ قوم میں سے تھا
اس یہودی مستفسر کے جواب میں وہ اس سامری کو اس قسم کی نیکی کا نمونہ
قرار دیتا ہے جو خدا ہم سے طلب کرتا ہے۔ تمثیل میں اس سامری کو بطور
محسن کے منتخب کرنا اعلےٰ درجہ کی دانائی کا کام تھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے
کہ خدا کا حقیقی فرزند کیسا ہونا چاہیئے۔ کیوں ایک یہودی کو ایک سامری
یا کسی غیر قوم کے آدمی کا مددگار نہ ٹھیرایا گیا مگر مسیح ایک ایسی مثال کے
ذریعہ سے سکھانا چاہتا تھا جو سوال کرنے والے کے قومی خیال کے مطابق
نہیں بلکہ عام انسانیت کے مطابق تھی۔ اسی وجہ سے اُس نے تمثیل میں
یہودی کو نہایت احتیاج کی حالت میں رکھا۔ خواہ اس فقیہہ اور لاوی

کو رحم نہ آوے۔ بلحاظ قومیت و مذہب ان کا فرض تھا کہ اپنے بھائی کی مدد کرتے۔ مگر اُس نے ایک ایسے اجنبی شخص کے دل میں رحم پیدا کیا جس کو یہودی نہائت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اگر کوئی یہودی ایک سامری پر اس قسم کا ترس کھاتا تو ایک انکسار کا فعل یا ثواب کا کام گنا جاتا لیکن جب ایک سامری کسی یہودی پر رحم کرتا ہے تو یہودیوں کی نظر میں اس نیکی کی حقیقی صفت بہتر طور پر ظاہر ہو جاتی ہے اس سے مسیح سکھاتا ہے کہ محبت ایک عالمگیر شے ہے وہ کسی خاص قوم یا مذہب یا استحقاق کے حلقہ میں مقیّد نہیں اگر تمام بنی آدم کے درمیان اس کو فی الحقیقت پھیلنا ضرور ہے تو اُس کو اس قسم کی تمام قیود سے پاک ہونا چاہیئے۔

(۹) محبت عالمگیر ہے۔ اخلاق کے وسیع حلقہ کا سوشل پہلو جو اس تعلیم میں ظاہر کیا گیا ہے ایک نہائت ضروری عمل ہے۔ گویا اس میں ہمیں ہمارے خداوند نے ایک بڑے بھاری سلسلے کے آخری درجے تک پہنچا دیا ہے۔ تمام اخلاقی تعلیم کا مدعا یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنے ذاتی منفعت کو اَوروں کا فائدہ سمجھے۔ اس طور پر اخلاق انسانی سوسائٹی کی بندش کا اصول ٹھیرتا ہے اگر سوسائٹی میں کُچھ نہ کُچھ نیکی نہ ہو تو وہ پل بھر قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر لوگ کسی حد تک ایک دوسرے کا اعتبار نہ کریں۔ تو اُن کا ایک دوسرے کے ساتھ بود و باش یا مل کر کام کرنا محال ہوگا۔ چونکہ وہ رفاہ عام کے اصول کے قائل ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ایکدوسرے کا اعتبار کرتے ہیں۔ سوسائٹی کی بعض ابتدائی حالتوں میں رفاہ عام کا خیال خاندان یا فرقہ کی حدود میں محدود ہوتا ہے جو اشخاص ان کی حدود سے خارج ہیں رہ ایسے خاندان اور فرقہ کے شرکاء کے نزدیک اخلاقی حدود

سے بھی باہر ہیں۔ جہاں سوشل انتظام کچھ ترقی کر گیا ہے وہاں رفاہ عام کا دائرہ شہر یا قوم یا مذہبی فرقے تک وسیع ہو جاتا ہے۔ مسیح نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ ہم اپنا فائدہ باقی سب کا فائدہ سمجھیں اور کوئی شخص بھی ہماری محبت کے حلقہ سے باہر نہیں ہے اس تعلیم سے یہ ظاہر ہے کہ اس نے فائدہ عام کے حلقہ کو حد درجہ کی وسعت دیدی ہے ❖

(۱۰) خلاصہ۔ اب ہم اُس درجہ تک آ پہنچے ہیں کہ جہاں سے اس تعلیم کے نتائج کا ضروری خلاصہ پیش کر سکتے ہیں۔ اب ہم صفائی سے دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے خداوند نے خالص اخلاقی تعلیم کے اصول کو کیسی صفائی کے ساتھ مگر نہایت وسیع اور مؤثر صورت میں ہمارے روبرو پیش کیا ہے بیرونی پہلو سے وہ اخلاق کے اس اعلےٰ تصوّر کو بادشاہت کے نام سے نامزد کرتا ہے جو ایک ایسا کامل سوشل انتظام ہے جس میں ہر فرد کو برکت حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہت کا آخری درجہ وہ منزلِ مقصود ہے جس کے رُخ خدا کی ہدایت سے دُنیا کا تمام کاروبار چل رہا۔ یہی وہ اعلےٰ مقصد ہے جو ہر ایک شخص کا ہدف ہونا چاہیئے۔ پھر بادشاہت ایک ایسی موجودہ شے بھی ہے۔ جو فی الحقیقت بنی آدم کے درمیان موجود ہے جہاں ایمان اور محبت اور نیکی ہے۔ یا یوں کہو کہ جہاں مسیح کی رُوح ہے وہاں یہ بادشاہت بھی پائی جاتی ہے در اصل اخلاقی معیار کا یہی وہ خیال ہے جو فی زمانہ زیادہ مروّج ہو رہا ہے۔ فلسفہ کے پہلو سے یہ مدتوں کی نکتہ چینیوں اور بحث کا نتیجہ ہے مگر یہاں پر ہمارے خداوند نے اس کو نہایت صاف اور مؤثّر طور پر ادا کر دیا ہے اور اس نے اس کو ایسے طریق پر پیش کیا ہے جو فلسفہ کی بحث اور پیچیدگیوں سے پاک اور معرّا ہے ❖

(۱۱) بقیہ خلاصہ سیرت۔ جو اعلیٰ تصور سیرت کا ہمارے خداوند نے پیش کیا ہے وہ بھی کچھ کم ناطق نہیں خدا خود ہمارا معیار ہے۔ ہمارے خداوند کی یہ تعلیم علم الاخلاق کے معلّموں کی تعلیم سے بہت بڑھ کر اور افضل ہے کیونکہ وہ تو نیکیوں کی فہرستیں پیش کرتے ہیں۔ مگر مسیح ایک ایسا محبت کا اصول سکھاتا ہے جو الٰہی ذات کا اصلی جوہر ہے اور جو نمونہ وہ اپنی شخصیت اور زندگی میں ظاہر کرتا ہے وہ اور بھی طاقتور ہے اسی نمونہ نے ہمارے اخلاقی عظمت کے خیال کو تہ و بالا کر دیا ہے اور تمام نیک اشخاص کے اندر ایک خاص قسم کا القا پیدا کر دیا ہے ٭

(۱۲) بقیہ خلاصہ محبت کا حلقہ۔ آخر الامر مسیح نے محبّت کے حلقہ کی وسعت کا اعلےٰ ترین تصوّر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ محبّت کا دائرہ عالمگیر ہونا چاہیئے۔ جس میں سب بنی آدم شامل ہیں۔ جو بھلائی ہم کرنا چاہتے ہیں وہ رفاہِ عام کے خیال سے کرنی چاہیئے جس سے کوئی شخص خارج نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں اپنے پڑوسیوں کو اپنے برابر پیار کرنا چاہیئے اور ہر فرقہ اور قوم اور مذہب کے آدمیوں کو اپنے پڑوسیوں میں شمار کرنا چاہیئے جو برکت ہم اپنے لئے طلب کرتے ہیں اس میں ان کا بھی حصہ سمجھنا چاہیئے ٭

چوتھا باب

زندگی اور ترقّی

(۱) گناہ- جس طرح ہمارے خداوند نے عجیب مؤثّر طور پر اور سنجیدگی کے ساتھ گناہ کے ہولناک ہونے کی تعلیم دی کبھی کسی نے نہیں دی- اکثر مقامات میں یہ تعلیم اس نے اپنے طرزِ تقریر کے ذریعہ سے ادا کی اور گناہ کی ماہیّت کی نسبت کوئی صریح الفاظ نہ فرمائے- مثلاً اُسی مقام پر جب اُس نے پرانی اور نئی شریعت کے تعلّق پر بحث کی جو متی کی انجیل کے پانچویں باب کی سترہ سے اڑتالیس آیات تک مندرج ہے- ہم اس مقام پر پیشتر ایک اور پہلو سے بحث کر چکے ہیں مضمون زیر بحث کے لحاظ سے اسوقت یہی دکھانا کافی ہے کہ جب مسیح نے یہ سکھایا کہ میری بادشاہت میں تمام پُرانی شریعت زیادہ عمیق ہو جائیگی تو اُس سے نیکی کی اشد ضرورت اور گُناہ کا نہایت ہولناک ہونا بھی صاف صاف مستنبط ہوتا ہے- دوسرے مقامات میں ہمارا خداوند گُناہ کی نسبت یہی تعلیم بذریعہ اعلےٰ اور نہایت ہولناک نصائح کے پیش کرتا ہے- مثلاً بعض گناہوں کی نسبت کہا گیا ہے- کہ ان کے مرتکب ہونے کی نسبت عذاب میں مرنا بہتر ہے جو کوئی ان چھوٹوں میں سے جو مجھ پر ایمان لائے ہیں کسی کو ٹھوکر کھلائے اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک بڑی چکی کا پاٹ اس کے گلے میں لٹکایا جائے اور وہ سمندر میں پھینک دیا جائے (مرقس ۹ : ۴۲) خواہ کتنا ہی نقصان

اُٹھانا پڑے گناہ کو کبھی غالب ہونے نہیں دینا چاہیئے اگر تیرا ہاتھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے کاٹ ڈال زندگی میں ٹنڈا ہو کر داخل ہونا تیرے لئے اس سے بہتر ہے کہ دو ہاتھ ہوتے ہوئے جہنّم کے بیچ اس آگ میں جائے جو کبھی بجھنے کا نہیں۔ اس تنبیہ کا نہایت موثر ہونا اس امر سے ظاہر ہے کہ مختلف الفاظ میں یہی نصیحت تین مرتبہ دُہرائی گئی ہے (دیکھو مرقس ۹ ۴۳ سے ۴۸) +

(۲) عدالت۔ جو تعلیم گناہ کی نسبت دی گئی وہ آئندہ عدالت کی تعلیم سے اَور بھی زور حاصل کرتی ہے۔ عدالت کا ذکر ہمارے خداوند نے اپنی تقریروں اور اقوال میں بار بار کیا مثلاً دیکھو متی ۷: ۱ و ۲ و ۲۲ و ۲۳ اور ۱۰: ۱۵ اور ۱۱: ۲۲ و ۲۴۔ اور ۱۲: ۳۶۔ اور چوبیس اور پچیس ابواب میں نیز لوقا اکیس باب و یوحنّا ۵: ۲۱ سے ۲۹ اور ۱۷: ۲ وغیرہ۔ سب سے واضح اور موثر مقام جس میں عدالت کا بیان ہے متی ۲۵ باب ۳۱ سے ۴۶ آیات میں ہے اس میں اُس عالمگیر عدالت کا ہولناک نقشہ نہایت صفائی سے کھینچا گیا ہے۔ جس میں بنی آدم اپنے اپنے اعمال کا حساب دینگے۔ اس سے بڑھکر گُناہ کے ہولناک ہونے کو کونسی بات دل پر نقش کر سکتی ہے +

(۳) محبت کے خلاف گناہ۔ سب سے مہیب مقامات میں جہاں گناہ اور عدالت کا ذکر کیا گیا ہے وہ گناہ قابل سزا ٹھیرایا گیا ہے۔ جو محبّت کے خلاف ہے مثلاً دیکھو مرقس کی انجیل ۹: ۴۲ وغیرہ مسیح کے چھوٹوں میں سے ایک کو ٹھوکر کھلانے کی نسبت عذاب میں مرنا بہتر ہے خصوصاً عدالت کے دن اس کی پُرسش ہوگی جس کا بیان متی کے ۲۵ باب میں ہے۔ تمام نیکی اور بدی محبت کی میزان میں تولی جائیگی۔ یعنی یہ دیکھا جائیگا کہ کس نے محبّت

کی اور کسی نے نہیں کی۔ ایک اور بات ہے جس سے اس اصول پر بہت
زور پڑتا ہے یعنی یہ کہ منصف ان لوگوں کے ساتھ اپنی یگانگت ظاہر کرتا ہے
جو محبّت کے مستحق تھے یا ہوئے چاہتے تھے۔ یگانگت محبّت کے اصول کو
عرش معلیٰ تک سرفراز کرتی اور اس کی فضیلت کو واضح کرتی ہے محبت
کے خلاف گناہ کا مہلک ہونا الٰہی معافی کی شرط سے ظاہر ہوتا ہے جس
کا ذکر ہمارے خداوند نے بار بار کیا۔ خصوصاً اس تمثیل میں جس میں اس
شرط پر بہت زور دیا گیا ہے۔ یعنی اس نا معاف کرنے والے نوکر کی
تمثیل (متی ۱۸: ۲۳ سے ۳۵) اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارا خداوند گناہ
کے اس پہلو پر اس قدر زور دینے سے یہ چاہتا تھا کہ اپنے سامعین کو
گناہ کی حقیقی ماہیت سے آگاہ کرے گناہ یہی نہیں ہے کہ انسان اس کے
کرنے سے جزا کو ہاتھ سے دھو بیٹھیگا یا خوشی کو کھو کر عذاب کا مستوجب ہو
جائیگا گناہ کو فقط بلحاظ اس کے نتائج کے نہیں دیکھنا چاہیئے خواہ وہ
کیسا ہی ہولناک کیوں نہ ہو۔ گناہ محبّت کی خلاف ورزی ہے۔ اور محبّت
خدا کی ذات اور خدا کی اعلےٰ مخلوقات کا اعلےٰ ترین قانون ہے۔ گناہ
ہے ایک جرم جو خود رب تعالےٰ کے خلاف ہے۔ ہر ایک گناہ محبّت کے
خلاف گناہ ہے اور محبت خدا کی ذات ہے اُس تمثیل میں اس نوکر کی خود
غرضی جو اپنے ہم خدمت کے خلاف تھی اس کو خدا کے خلاف گناہ کا مرتکب
ٹھیراتی ہے (متی ۱۸: ۳۲ سے ۳۴) +

(۴) جزاء۔ ہمارا خداوند اس امر پر بہت زور دیتا ہے کہ گناہ کی
سزا اور نیکی کی جزا ہوگی۔ مگر جیسا ہم نے ابھی دیکھا ہے نیکی اور بدی کی
نسبت اس کی یہ سب سے گہری تعلیم نہیں ہے۔ سزا اور جزا کا مضمون جو

سیرت کا ماحصل ہے مشکلات سے پُر ہے۔ کیونکہ اس کے بیان میں مبہم الفاظ اور خیال کی پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ جزا حاصل کرنے کے مقصد سے زندگی بسر کرنا بُرا نہیں ہے بشرطیکہ صحیح جزا ہمارا ہدف ہو گناہ کا اس خیال سے ترک کرنا بُرا نہیں ہے کہ اُس کے کرنے سے سزا ملتی ہے بشرطیکہ ہم سزا کی حقیقی ماہیت کو کماحقہ دیکھیں۔ کسی ایسی جزا کو حاصل کرنیکی نیّت سے نیکی کرنا جو محض ہماری ذات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے یا اس غرض سے کہ ہم بعض تکالیف سے بچنا چاہتے ہیں جو ہم پر وارد ہونے والی ہیں نہ فقط بُرا بلکہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اس قسم کا فعل گو بظاہر اخلاقی قانون کے مطالبہ سے مطابق ہو فی الحقیقت نیکی نہیں ہے اس کا مخرج پاک دل نہیں ہے اور نہ اس میں صحیح مقصد پایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ محض خودغرضی ہے۔ مگر اس سے جزا کا سوال حل نہیں ہوتا کیونکہ بعض قسم کی جزا ہے جس میں خودغرضی پائی نہیں جاتی۔ اور اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں کہ اس کا ہدف اعلیٰ ترین اور بے غرضی جزا ہو اس لحاظ سے جزاء ایک ایسا مدعا ہے جو نیک عمل کا ہدف ہوتا ہے۔ تمام چال وچلن کا کچھ نہ کچھ ہدف ہونا چاہیئے نیک عمل کا ہدف نیکی نہیں ہے۔ جو حقیقی مدعا ہے بذات خود ہی جزا ہے۔ ہمارے خداوند کی تعلیم میں حقیقی اور اعلےٰ ترین مدعا وہی ہے جس کا ہدف بادشاہت ہے۔ پہلے بادشاہت کی تلاش کرو ہمارے خداوند کی تعلیم پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ بادشاہت بذات خود ایک جزا ہے بعض اوقات اس کو خداوند کی خوشی کہا گیا ہے (متی ۲۵ : ۲۱) کبھی فقط بادشاہت (متی ۲۵ : ۳۴) اور کبھی حیاتِ جاودانی (متی ۲۵ : ۴۶) یہ سب الفاظ اسی جلیل مدعا کو ظاہر کرنے کے مختلف

طریق ہیں جس میں خود خدا اپنے سب فرزندوں کے ساتھ ایک غیر منقسم برکت کی حالت میں رہتا ہے اس لئے اُس جزا کی خاطر زندگی بسر کرنا یہ ہے کہ ہم نیکی کی خاطر زندگی بسر کریں +

(۵) اس زندگی میں جزا- مندرجہ بالا بیان میں لفظ بادشاہت اپنے اعلیٰ ترین معنی میں استعمال کیا گیا ہے- مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نیکی کی فوری جزا یعنی خوشی جو نیکوں کو حاصل ہوتی ہے- فی الحقیقت اسی قسم کی جزا ہے- کیونکہ جیسا ابھی بیان کیا گیا ہے- تمام نیک چال و چلن اس بادشاہت کو جزوی طور پر محسوس کرتا ہے انسان کو نیکی کرنے سے برکت حاصل ہوتی ہے کیونکہ نیکی کرنے سے وہ اس درجہ تک پہنچ جاتے ہیں جو اُن کا منزل مقصود تھا اور وہ بادشاہت کو اسی حد تک معلوم کرتے ہیں جو اُن کی حیثیت اور حالات کے مطابق ہے- یہی وہ جزا یا برکت یا خوشی ہے جو نیکی کا صلہ ہے- اس سے صاف ظاہر ہے کہ جزا کی خاطر زندگی بسر کرنا یا کام کرنا کوئی عیب نہیں ہے- نیکی یا بدی اس جزا کی ماہیت پر موقوف ہے جس کی خاطر کوئی فعل کیا جاتا ہے +

(۶) سزا- سزا کا سوال بھی ایک حد تک جزا سے مشابہ ہے- بادشاہت سے خارج کئے جانے کا خوف قیمتی برکت کا نقصان- بے فائدہ زندگی بسر کرنا- محبت کے حلقہ سے باہر رہنا- خدا سے جدائی- یہ اس قسم کی باتیں ہیں جن کا اثر ہر ایک انسان کے دل پر غایت درجہ کا ہوتا ہے- یہ نیک چلنی کے حقیقی مقصد کا فی الحقیقت دوسرا پہلو ہے- جس کو اس مقصد کا نفی پہلو کہہ سکتے ہیں- مگر اس میں کچھ اور بھی شامل ہے- کیونکہ سزا کا خوف اکثر درد سے پہلو تہی کرنا ہے- انسان اپنے بداعمال کے خیال سے اس

لئے دہشت کھاتا ہے کہ وہ ان کے باعث تکلیف سہنے سے ڈرتا ہے
یہ خوف سراسر خودغرضی پر مبنی ہے۔ اس کو اعلےٰ مقصد نہیں کہہ سکتے
مگر یہ خوف اکثر اعلےٰ مراتب کی طرف پہلا قدم ثابت ہوتا ہے۔ شریعت
کی کڑک اور عذاب کا خوف جو اس سے دل میں پیدا ہوتا ہے اس
بھارے شور کی مانند ہے جو بیہوش سونے والے کو بیدار کر دیتا ہے
جب اس کی نیند اچھی طرح سے کھُل جاتی ہے وہ اشیاء کی حقیقت کو
بہتر طور پر معلوم کر سکتا ہے +

(۷) اخلاقی ترقی۔ پیشتر ازیں جو بیان گناہ اور عدالت اور
فعل کے نتائج کا کیا گیا۔ وہ ہمارے خداوند کی تعلیم میں اخلاقی ترقی
کے عام مضمون کے لئے بطور تمہید کے تھا۔ اخلاقی ترقی کے ضمن میں
توبہ کا ذکر کیا جائیگا جو اخلاق کا شروع ہے پھر خود انکاری کا جو اخلاقی
جنگ میں غالب آنے کی ضروری شرط ہے اور بعد ازآں ایمان اور
اُمید کا جس سے رُوح کو طاقت حاصل ہوتی ہے +

(۸) توبہ۔ یہ انجیلی تعلیم کا اول اصول ہے توبہ کرو کیونکہ آسمان
کی بادشاہت نزدیک آ گئی ہے۔ یہ یوحنّا اصطباغی کی تعلیم کا لب لباب
تھا اور یہی ہمارے خداوند کا اول اعلان تھا۔ توبہ سے مراد ہے دل
اور زندگی کا بدل جانا اور ارادہ کے رُخ کا تبدیل ہو جانا یہ انقلاب
دل اور ارادہ دونوں میں ہوتا ہے ضرور ہے کہ گنہگار پر اپنی اصلی حالت
منکشف ہو جائے تاکہ وہ گناہ کی سخت کراہیّت کو پہچان لے۔ وہ معلوم
کر لیتا ہے کہ گناہ کرنے سے بہترین شے کا نقصان اُٹھانا پڑیگا یعنی ؔ
بادشاہت اور خدا کی محبت سے خارج کیا جائیگا۔ مسیحی تجربہ میں توبہ

اور ایمان کو علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ مقدس کتاب میں عموماً دونوں کا ذکر اکٹھا کیا جاتا ہے (مثلاً دیکھو مرقس ۱: ۱۵ و اعمال ۲۰: ۲۱ و عبرانیوں ۶: ۱ وغیرہ) گناہ کی طرف پیٹھ پھیرنا خدا کی طرف رُخ کرنا ہے۔ فعل تو ایک ہی ہے۔ مگر اس کے دو پہلو یا اندراج ہیں۔ اسی وجہ سے فی زمانہ تبدیل قلب میں وہ تمام رُوحانی تجربہ شامل کیا جاتا ہے جو کتاب مقدس میں توبہ اور ایمان سے ادا کیا جاتا ہے ؎

(۹) خود انکاری مسیحی زندگی میں توبہ ایک ہی وقت کا تجربہ نہیں بلکہ یہ ایک آغاز ہے وہ ہمیشہ بار بار دُہرایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ہمیشہ گنُاہ سے پھر کر خدا کی طرف رُخ کرنے کی ضرورت رہتی ہے اس امر سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی بھر بدی کے ساتھ مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس سے خود انکاری کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ ابتدا میں خودی کو مارنا ضروری ہے کیونکہ موروثی کمزوری یا عادت کے باعث گنُاہ نے انسان کے دل کو قابو کر رکھا ہے۔ ضرور ہے جو بات خدا کی مرضی کے خلاف ہے اُس کو ترک کرنے کا ارادہ کیا جائے۔ اور یہ کوئی آسان بات نہیں ہے مگر یہ مقابلہ بند نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اکثر کسی خاص حد تک اَور بھی ضروری ہوتا جاتا ہے سب سے بڑا روحانی مقابلہ مسیحی تجربے کے آغاز میں نہیں ہؤا کرتا۔ بلکہ کچھ عرصہ بعد دورانِ زندگی کے ابتدائی حصہ میں معلوم ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے خداوند نے اپنے شاگردوں کو اکثر مرتبہ آگاہ کرنا ضروری سمجھا کہ وہ اس کی خاطر خود انکاری کرنے کو تیار رہنا اپنا فرض عظیم سمجھیں کہ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی بیٹے یا بیٹی کو

مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب اُٹھا کر میرے پیچھے نہیں چلتا وہ میرے لائق نہیں جو کوئی اپنی جان پاتا ہے اُسے کھوئیگا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئیگا۔ اُسے پائیگا (متی ۱۰: ۳۷ سے ۳۹ نیز دیکھو لوقا ۱۴: ۲۵ سے ۲۷ وغیرہ) یہی وجہ تھی کہ ہمارے خداوند نے ان جماعتوں کو جو اس کے پیچھے پیچھے بھیڑ لگائے آرہی تھیں۔ پھر کر فرمایا کہ اگر تم فی الحقیقت میری پیروی کرنا اور میرے شاگرد بننا چاہتے ہو تو سمجھ لو کہ تمہیں کیا کیا تکلیفیں اُٹھانی پڑینگی (لوقا ۱۴: ۲۸ سے ۳۳) تم میں سے جو کوئی سب کچھ ترک نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا +

(۱۰) خود انکاری اور نیکی۔ اخلاقی پہلو سے خود انکاری بذات خود نیکی نہیں ہے۔ یعنی یہ کوئی ایسا ہدف نہیں ہے جس کو ہمیشہ مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کیونکہ یہ اعلےٰ مقصد کے حصول کا ایک بڑا بھاری ذریعہ ہے۔ نیکی یا نیک چلن کے پیدا کرنے میں یہ ایک ضروری شرط ہے۔ جب بادشاہت کاملیت میں ظاہر ہو جائیگی تو خود انکاری کی کچھ ضرورت نہ رہیگی محبّت سب چیزوں پر حکمران ہو گی۔ اور کامل محبّت سے کامل خوشی پیدا ہو گی مگر جس ناکامل حالت میں ہم اس دنیا میں بود و باش کرتے ہیں اس میں ترقی کرنے کے لئے خود انکاری از بس ضروری ہے +

(۱۱) ایمان اور امید۔ اخلاقی معلموں کے لئے یہ عقدہ ہمیشہ لاینحل رہا ہے کہ انسان کو شریعت کے پورا کرنے کی طاقت کیونکر حاصل ہو۔ شریعت کا بیان کرنا اور اس پر عمل کرنا کے وجوہات کو پہچاننا ممکن تھا مگر

جب انسانی دل کے رگ و ریشے میں سرایت کی ہوئی بُرائی اور انسانی ارادے کی جبلّی کمزوری پر غور کی جاتی تھی اور گنہگار دریافت کرتا تھا کہ مجھے شریعت کے پورا کرنے کی طاقت کہاں سے حاصل ہوگی تو اس کے جواب میں کسی نے ایک لفظ تک نہ کہا اسی امر میں خصوصاً ہمارا خداوند تمام اخلاقی معلموں سے بہت بڑھ کر فائق ہے۔ وہ طاقت کو مہیّا کرتا ہے اور وہ طاقت خود ہی ہے۔ اس سے آگے جو کچھ ہمیں کہنا ہے اس پر اس رسالہ کے دوسرے حصہ میں غور کی جائیگی۔ اس موقع پر ہم مختصراً ان اندرونی طریقوں کا ذکر کرینگے جن کو مسیح نے انسانی دل کے اندر اس بڑی اخلاقی طاقت کے عمل کے لئے ضروری روحانی شرطیں ٹھہرایا اور وہ طریقے ایمان اور امید ہیں ؟

(۱۲) ایمان۔ ہمارے خداوند کی تعلیم میں ایمان ایک نہائت ضروری پایہ رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کو برکت حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ وہ فرماتا ہے تمہارے اعتقاد کے موافق تمہارے لئے ہو (متی ۹ : ۲۹) یہی وہ قانون ہے جو عوام کے ساتھ ہمارے خداوند کے تمام تعلقات میں ظاہر ہوتا ہے اسی اصول کی بابت ایک اَور خاص موقع پر اُس نے فرمایا کہ تیرے ایمان نے تجھے بچایا۔ جہاں ایمان عجیب طور پر ظاہر ہوتا تھا۔ اس موقع پر مسیح سب سے اعلےٰ توصیفی الفاظ استعمال کرتا تھا پطرس کا اقرار (متی ۱۶ : ۱۶ و ۱۷) صوبہ دار جس کے ایمان کی نسبت مسیح نے تعجّب کرکے فرمایا کہ میں نے ایسا ایمان اسرائیل میں بھی نہیں پایا (لوقا ۷ : ۹) اس کی دو عمدہ مثالیں ہیں ایمان کے لئے مسیح اپنے سب سے عجیب وعدے کرتا ہے (متی ۷ : ۷ سے ۱۱ و مرقس ۹ : ۲۳ و ۲۴)

و ۱۱: ۲۲ سے ۲۴ وغیرہ) مگر سب سے بڑھ کر یوحنّا کی انجیل میں وہ تعلیم پائی جاتی ہے جس میں ایمان کی ضرورت کو پورے طور پر واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً ایمان ابدی زندگی کی شرط ٹھیرایا گیا ہے (یوحنا ۳: ۱۵ و ۳۶ و ۵: ۲۴ وغیرہ) پھر ایمان فرائض میں سے اہم ٹھیرایا گیا ہے۔ چنانچہ یوحنّا کی انجیل کے چھٹے باب کی انتیس آیت میں لکھا ہے کہ خدا کا کام یہ ہے کہ جسے اُس نے بھیجا ہے اس پر ایمان لاؤ اسی کے ذریعے بڑے بڑے کام ہوتے ہیں۔ جو مجھ پر ایمان لائیگا یہ کام جو مَیں کرتا ہوں وہ بھی کرے گا۔ بلکہ ان سے بھی بڑے کام کریگا۔ کیونکہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں (یوحنا ۱۴: ۱۲) مگر ان سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ہمارا خداوند ہمیشہ یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ تمہارے ایمان کا مستحق میں ہوں۔ چوتھی انجیل میں مسیح نے سب سے بڑھ کر اسی پر زور دیا +

(۱۳) ایمان کی ماہیت۔ جس ایمان کے بیان سے ہمارے خداوند کی تعلیم بھری پڑی ہے وہ محض کوئی دماغی رضامندی نہیں ہے اور نہ یہ خدا کے اُس دعوےٰ کو ظاہری طور پر تسلیم کر لینا ہے کہ میں انسان کی اطاعت کا سزاوار ہوں۔ ایمان کا تعلق اخلاق اور دماغ دونوں کے ساتھ ہے۔ یہ ہے دل اور دماغ دونوں کے حوالے کر دینا ایمان میں انسان خدا کے ساتھ وہ تعلق پیدا کر لیتا ہے جس میں بھروسہ اور شخصی اعتقاد پایا جاتا ہے گویا انسانی روح تسلیم کر لیتی ہے کہ خدا ہی میری حقیقی پناگاہ ہے ایمان خدا کی سیرت کو پہچان کر اس پر توکل کرنا ہے ایمان بصیرت ہے اور ایسا توکل جو بصیرت سے حاصل ہوتا ہے۔ غرض یہ خدا کے ساتھ اخلاقی اتحاد کے رشتہ میں قائم ہو جانا ہے۔

یہی وہ ذریعہ ہے جس سے خدا انسان کی اخلاقی زندگی کی طاقت بن جاتا ہے +

(۱۴) امید - یہ فی الحقیقت ایمان کا ایک پہلو ہے یہ وہ ایمان ہے جس کا رُخ آیندہ زمانہ کی طرف ہے اگر کامل اخلاقی زندگی کو حقیقی ترقی کرنا ہے تو اس کا کوئی خاص مدّعا ہونا چاہیئے - اور وہ مدّعا جیسا کہ گذشتہ بیان سے ظاہر ہے وہی اعلیٰ معراج ہے - جو ہر ایک نیک عمل اور نیک زندگی کا ہدف ہونا چاہیئے - اور وہ ہدف اپنی بادشاہت اپنی کامل صورت میں ہے جس طرح ہمارے خداوند نے اپنے تئیں ایمان کا مقصد قرار دیکر ایمان کی تعلیم دے - اسی طرح اس نے ہمارے سامنے امید کی - ایک اعلیٰ شے رکھ کر امید رکھنا سکھایا - ہمیں اس نے یہ دُعا مانگنا سکھایا کہ تیری بادشاہت آئے - جس سے اُس نے اپنی اُمت کے دلوں میں امید کا ایک دائمی چشمہ جاری کیا - جو ہر زمانہ میں رواں رہنے والا ہے تعلیم اور تمثیل کے ذریعہ اس نے اپنے شاگردوں کے دل پر یہ نقش کیا کہ بلاناغہ بیدار رہنا کیسا اشد ضروری ہے - ان کا فرض ہے کہ ہمیشہ اپنے خداوند کے استقبال کے لئے تیار رہیں - وہ نہیں جانتے کہ وہ کس گھڑی واپس آئیگا - مگر اس بات کا ان کو یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن قدرت اور بڑے جلال کے ساتھ آنے والا ہے - وہ جانتے ہیں کہ بالآخر وہ بدی پر ضرور غالب ہوگا - اس لئے اس دنیا میں ہوتے ہوئے وہ جاگتے اور جانفشانی کرتے ہیں - کیونکہ ان کے سامنے وہ امید موجود ہے جو ان کی جان کا ایسا لنگر ہے جو ثابت اور قائم رہتا ہے (عبرانیوں ۶: ۱۹) +

(۱۵) مسیحی اعلےٰ امید۔ مسیحی مذہب سب سے بڑھ کر اس امر کا قائل ہے کہ دنیا کے تمام حوادث انسان کی بہتری کے لئے ہوتے ہیں۔ اور اس اعتقاد کی وجہ یہ ہے کہ یہ مذہب اور مذہبوں سے زیادہ اُمید کا مذہب ہے۔ جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ دنیا کا حال بدتر ہوتا جاتا ہے وہ یہ دکھا کر کہ بالجملہ انسانی زندگی میں خوشی کی نسبت رنج و تکلیف زیادہ ہے اپنے دعوے کو اپنے زعم میں ثابت کر دیتا ہے۔ مگر باوجود اسکے مسیحی اُمید رکھنے والا ایسے لوگوں کی دلیل قبول کر کے بھی اپنی جگہ پر جما رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سب چیزیں مل کر بہتری کے لئے کام کر رہی ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ بادشاہت اپنے کامل جلال میں آئیگی اور ابدی محبت سب پر مسلط ہوگی۔

(۱۶) مذہب کی ضرورت۔ اب ہم اپنے خداوند کی اخلاقی تعلیم کے مقاصد کے خاتمہ پر آ پہنچے ہیں۔ اس سے یقیناً ہمارے دل پر ایک تصوّر باقی رہ گیا ہے کہ اخلاقی تعلیم محض ایک نیم صداقت ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے دینی تعلیم کی ضرورت ہے۔ سچ تو یوں ہے۔ کہ ہم اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ جس کے آگے ہمارے خداوند کی مذہبی تعلیم کا خیال ہمارے دل میں آ موجود ہوتا ہے۔ جس کے بغیر ہماری تمام بحث بےمعنی ہوگی۔ اُسی دینی خیال کے ہونے سے ہمیں اس اخلاقی تعلیم کے الفاظ میں گہرے معنی نظر آتے ہیں۔ ایمان اور امید پر بحث کرتے ہوئے ہم مذہب کے حدود تک پہنچ گئے ہیں اور ضرور ہے کہ ہم اس حد سے عبور کر کے ایک ایسے خوب صورت اور بھاری علاقہ کی سیر کریں جو ملک اخلاق سے بہت چڑھ کر خوب صورت اور وسیع ہے۔

دوسرا حصّہ

دینی تعلیم

پانچواں باب

باپ

(۱) مذہب اور اخلاق۔ ہمیں اپنے خداوند کی تعلیم کے دینی مقاصد کو اس کتاب کے تنگ احاطہ میں کماحقہ بیان کرنا ناممکن ہوگا اس لئے ہم فقط ایک عام خاکہ پر اکتفا کرینگے۔ مگر اس خاکہ کی ضرورت اس لئے لاحق ہوگی کہ جیسا پیشتر بیان ہو چکا ہے۔ ہم اپنے خداوند کی اخلاقی تعلیم کو اس کی مذہبی تعلیم سے سراسر جدا نہیں کر سکتے ان کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا تعلق ہے۔ اس لئے ایک کا ذکر دوسرے کے بغیر پورے طور پر نہیں ہو سکتا۔ اخلاقی تعلیم مذہب سے القا اور طاقت

اور واجبیّت کا حق حاصل کرتی ہے۔ اور دینی تعلیم اُن اصولوں کا مہیّا کرتی ہے جو اخلاقی زندگی کی حقیقت اور عظمت کا تاج ہیں۔ ہمارے خداوند کی تعلیم کا رُخ زیادہ تر مذہب کی طرف تھا اس لئے جب ہم اخلاقی معاملات پر غور کرنے میں اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں تو ہمیں بہت کچھ مذہبی طرزِ خیال کو استعمال کرنا پڑتا ہے اس وجہ سے جیسا کہ غور کرنے سے فوراً معلوم ہو جائیگا۔ جس اخلاقی تعلیم کا بیان ہم حصہ اول میں کر چکے ہیں وہ ایک دینی پہلو بھی رکھتی ہے جس کی جھلک بارہا ہم پر پڑ چکی ہے +

(۲) دو منزلیں۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ہمارے خداوند کی تعلیم میں دو خاص منزلیں ہیں۔ اول منزل جو زیادہ تر اخلاقی حصہ ہے بہترین طور پر پہاڑی وعظ میں واضح کی گئی ہے۔ دوسری منزل خصوصاً دین سے متعلق ہے جو مسیح کی دوران خدمت کی ترقی کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے اور جس کا سب سے افضل بیان اُس اعلےٰ تقریر میں پایا جاتا ہے جو یوحنّا کی انجیل کے چودھویں پندرھویں و سولھویں ابواب میں مسطور ہے۔ حصہ اول میں ہم نے خصوصاً پہلی منزل پر غور کر لی۔ چنانچہ جو حوالجات کتاب مقدس میں سے وقتاً فوقتاً پیش کئے گئے ان سے واضح ہوگا کہ وہ خصوصاً اوّل تین انجیلوں کے ابتدائی حصوں میں سے لئے گئے تھے۔ اس دوسرے حصہ میں ہم اس دوسری منزل پر غور کرینگے اور ہمارے حوالجات مسیح کی تعلیم کے آخری حصہ اور چوتھی انجیل سے اخذ کئے جائیں گے۔ جو مقاصد دوسری منزل کی تعلیم میں موجود ہیں ان مقاصد کی نسبت جن کا ہم پیشتر بیان کر آئے ہیں زیادہ وسیع اور عمیق ہیں اور جو دقیق سوالات ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ زیادہ

عجیب اور پیچیدہ ہیں۔ اس سے ہمیں خبردار رہنا چاہیئے مبادا ہمارے
خیالات ہمیں جائز حدود سے باہر اُڑا نہ لیجائیں۔ اگر ہم سادہ طور پر
ان خیالات کو جو حیرت انگیز ہیں اور خدا اور انسان اور ابدیت کی
نسبت ہیں اور جن کو ہمارے خداوند نے بہت عرصہ ہؤا اپنے شاگردوں
کو عجیب طرز پر سکھایا۔ اپنے ذہن میں لاسکیں تو ہمارے لئے بس ہے +

(۳) خدا۔ مسیح نے خدا کی نسبت انسانی خیالات کو عمیق اور زیادہ
کردیا۔ نہ فقط اپنی تعلیم سے بلکہ اپنے طرز معاشرت اپنے تجربے کے ظہور
اور سب سے بڑھ کر اپنی ذات کے ذریعہ سے جس کی نسبت اُس نے
فرمایا کہ میں خدا کے ضمیر اور ارادے کا مکاشفہ ہوں (دیکھو متی ۱۱ : ۲۷
و ۲۵ : ۳۱ وغیرہ + نیز یوحنا ۵ : ۱۹ وغیرہ - و ۸ : ۱۲ وغیرہ - و ۱۰ : ۲۵ وغیرہ
و ۱۲ : ۲۴ وغیرہ - و ۱۴ و ۱۵ ابواب) اس احسن طریقہ سے جہان نے
خدا کی نسبت ایک سبق سیکھا ہے جو باوجود اپنے منکر اور کافر ہونے
کے وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسیح کی تعلیم کو اسکی
زندگی سے علیحدہ کرنا دشوار ہے بلکہ مضمون زیر بحث میں ہمیں مسیح کی
تعلیم کے ساتھ اس کی ذات کا لحاظ بھی رکھنا پڑیگا۔ ہم اس کی زندگی
اور تعلیم دونوں سے یہ سیکھتے ہیں کہ وہ خدا کو ایک ہمیشہ موجود رہنے
والی حقیقت سمجھتا تھا۔ اگر ہم انجیل کے بیان کو غور سے مطالعہ کریں تو
اس سے ضرور یہ نتیجہ نکالنا پڑیگا کہ مسیح خدا کی حضوری اور اسکی ذات اس
کے خیالات اور اپنے ساتھ اس کے تعلّق کو حد درجہ تک محسوس کرتا
تھا وہ خدا کے باطن کو ایسی صفائی کے ساتھ دیکھتا تھا کہ جس کی نظیر
انسانی تجربے میں پائی نہیں جاتی +

(۴) مسیح خدا کے دل کا کاشف ہے۔ یہی اس طاقت کا راز عظیم ہے جو ہمارا خداوند تمام ارواح پر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس تعلیم کو جو مسیح نے خدا کی نسبت دی اُس کو با اختیار معلّم سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ مسیح ہمیشہ اختیار والے کی طرح کلام کرتا ہے وہ کامل علم کی گہرائی میں سے اپنی تعلیم نکالتا ہے۔ اور جب انسانی رُوح اسکی آواز کو فی الحقیقت سُن سکتی ہے تو اس کا نتیجہ ایمان ہوتا ہے جو مکاشفہ مسیح نے انسان پر کیا وہ ایجاب کا مادہ اپنے اندر ہی رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسی بھاری بات ہے کہ سوائے راستی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا وہ خدا کی نسبت ایسا مکاشفہ ہے جیسا کہ ہونا چاہیئے۔ جب انسان ایک دفعہ اُسے دیکھ لیتا ہے تو پھر خدا کی نسبت کسی اَور بیان کو قبول نہیں کرسکتا اس دعوے میں ہم کسی منطقی دلیل یا دلائل کے سلسلہ سے کام نہیں لے رہے۔ بلکہ فقط واقعات کو بطور خلاصہ کے پیش کر رہے ہیں یہ اس مکاشفہ کی نسبت جو یسوع مسیح نے خدا کی نسبت پیش کیا تواریخ کا فیصلہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ مکاشفہ ہے کیا اس سوال کا جواب چند فقروں میں ادا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جس مکاشفہ کا ذکر ہو رہا ہے اُس کا کامل ترین ظہور خود مسیح ہے۔ مگر بعض بھاری اصول اس قسم کے ہیں جن کو الفاظ میں ادا کر سکتے ہیں اور اس وقت ہم انہیں پر غور کریں گے ✢

(۵) خدا کی ابوّیت۔ یہ خیال سارے عہد نامہ میں خاص طور پر پایا جاتا ہے اور ہمارے خداوند ہی کی تعلیم سے حاصل کیا گیا ہے بطور ایک عام تصوّر کے وہ فقط مسیحی مذہب میں پایا نہیں جاتا۔ چنانچہ

عہد عتیق کے اکثر مقامات میں اس کا ذکر ہے۔ مثلاً لکھا ہے کہ جس طرح باپ بیٹوں پر ترس کھاتا ہے اسی طرح خداوند اُن پر جو اُس سے ڈرتے ہیں ترس کھاتا ہے (زبور ۱۰۳: ۱۳) علیٰ ہذا القیاس استثنا کی کتاب کے بعض مقامات میں خدا کو اسرائیل کا باپ کہا گیا ہے (۱: ۳۱ و ۸: ۵ و ۳۲: ۶) یہی خیال عہد عتیق میں مختلف طور پر پایا جاتا ہے (مثلاً دیکھو یسعیاہ ۶۳: ۱۶ و ۶۴: ۸ و یرمیاہ ۳: ۴ و ۱۹ و ہوسیع ۱۱: ۱ وغیرہ) ہلکے طور پر یہ خیال بت پرستوں کے درمیان بھی موجود ہے چنانچہ وہ رب تعالیٰ کو الٰہوں اور انسانوں کا باپ مانتے تھے مگر جیسا کہ ہمارے خداوند کی تعلیم سے ظاہر ہے خدا کی ابوّیت ایک بالکل نئی بات بن گئی۔ اس میں ایک ایسی طاقت اور حقیقت پیدا ہو گئی جو پیشتر موجود نہ تھی۔ سچ تو یوں ہے کہ یہ نئی صفت اور طاقت خود مسیح کی ذات کی طفیل ہے۔ اس نے اس خیال کو اپنی ذات سے اور خدا کی نسبت انسان کو اپنے خیالات کے دکھانے سے عظمت بخشی۔ اندیشہ ہے کہ ہم خدا کی ابویت کو موجودہ زمانہ کے ان خیالات کے مطابق سمجھ بیٹھیں جو پُر محبّت اور رحمدل مسیحی باپ کی نسبت ہوا کرتے ہیں۔ سوسائٹی کی ہر حالت میں ابویت کے لئے سرگرم محبّت کا خیال ضروری نہیں بعض اوقات اس سے نہایت درشت اور بیدردی کا سلوک مراد لی گئی ہے اور ہمارے درمیان بھی اگر الٰہی ابویت کے خیال کو مسیح اور اسکی تعلیم کے طریقہ سے جدا کیا جائے تو یہ خیال دلکش اور جلیل القدر نہ رہیگا مسیح کی تعلیم میں خدا کی ابویت تین طور پر پیش کی گئی ہے ✦

(۲) ہمارے خداوند کا باپ۔ مسیح خدا کو ہمیشہ میرا باپ

کہا کرتا ہے اور یہ نام ہمارے خداوند کو نہائت عزیز تھا۔ اس سے اس کے خدا کے ساتھ تعلّق کا اندرونی احساس مترشح ہوتا تھا۔ اور وہ اس پر زور دینا پسند کرتا تھا۔ جب وہ اس طور پر استعمال کیا جاتا تھا تو اس کے خاص معنی ہؤا کرتے تھے۔ وہ ایک خاص معنی میں خدا کا بیٹا تھا۔ اور اس معنی میں کوئی عام آدمی بیٹا نہیں کہلا سکتا۔ جس طریق پر لفظ میرا باپ اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ وہی اس حقیقت پر شاہد ہے۔ مثلاً ہمارا خداوند فرماتا ہے کہ جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا اقرار کریگا۔ میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اس کا اقرار کرونگا الخ (متی ۱۰: ۳۲ و ۳۳) نیز اس عجیب قول میں جو متی ۱۰: ۳۲ و ۳۳ میں درج ہے کہ میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا اور بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اسے ظاہر کرنا چاہے۔ ان مقامات میں لفظ میرا باپ بظاہر اس غرض سے استعمال کیا گیا ہے کہ ہمارے خداوند کو خاص معنی میں ابن اللہ مشخص کیا جائے۔ مندرجہ بالا دوسرے حوالے میں اس خاص ابنیت کی گویا تعریف کی گئی ہے۔ مقدس یوحنّا کی انجیل میں بہت سے اس قسم کے مقامات ہیں۔ مثلاً میرا باپ ابتک کام کرتا ہے اور میں بھی کام کرتا ہوں (یوحنّا ۵: ۱۷) میں اور باپ ایک ہیں (یوحنا ۱۰: ۳۰) اس سے پیشتر کی آیت میں لفظ میرا باپ آیا ہے۔ اس انجیل کے چودھویں باب سے سترھویں باب تک مسیح باپ اور میرا باپ ایسے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جس سے باپ اور بیٹے میں خاص قریبی تعلق ثابت ہوتا ہے۔ یوحنّا ۲۰: ۱۷ میں وہ اپنی خاص

ابنیت کا اوروں کی ابنیت کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے کہ اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں (نیز دیکھو متی ۷: ۲۱ و ۱۶: ۱۷ و ۱۸: ۱۰ و ۱۹ و ۳۵ و ۲۰ : ۲۳۔ لوقا ۲: ۴۹ و ۲۲: ۲۹ و ۲۴: ۴۹۔ یوحنا ۵: ۲۰ سے ۴۵ و ۶: ۳۲ و ۸: ۱۹ وغیرہ و دیگر مقامات) ان مقامات کی کثرت سے ظاہر ہے کہ ہمارا خداوند اس بات کو جو اس کی تقریروں میں پائی جاتی ہے کس قدر محسوس کرتا تھا اور کہ یہ اس اعلان کے عین مطابق تھا جو اس کی خدمت کے شروع میں آسمان سے کیا گیا۔ کہ تو میرا پیارا بیٹا ہے تجھ سے میں خوش ہوں (مرقس ۱: ۱۱)۔ یہی اعلان اُس پہاڑ پر بھی کیا گیا جہاں مسیح کی صورت بدل گئی تھی (مرقس ۹: ۷) +

(۷) **مسیح کے شاگردوں کا باپ**۔ ہمارے خداوند نے اپنے شاگردوں کو سکھایا کہ اپنے آپ کو ایک خاندان سمجھیں۔ جس کا باپ خدا ہے۔ پہاڑی وعظ بادشاہت کا قانون ہے مگر اس کی عبارت کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ بیجا نہیں کہ وہ خدا کے خاندان کا قانون ہے اس میں مسیح اپنے شاگردوں کی طرف مخاطب ہو کر ہمیشہ خدا کی نسبت تمہارا باپ استعمال کرتا ہے (متی ۵: ۱۶ و ۴۵ و ۴۸ نیز ۶: ۱ و ۸ و ۱۴ و ۱۵ و ۳۲ اور ۷: ۱۱ وغیرہ) بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے چھوٹے گروہ کو خطاب کرتے ہوئے یاد دلاتا ہے۔ کہ تمہارا باپ آسمان میں ہے وہ فرماتا ہے کہ اے چھوٹے گلے نہ ڈر کیونکہ تمہارے باپ کو پسند آیا کہ تمہیں بادشاہت دے (لوقا ۱۲: ۳۲) بعض اوقات وہ شاگردوں کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ وہ ایسے باپ کے فرزندوں کے

لائق چال چلن۔ چنانچہ ایک موقع پر وہ فرماتا ہے کہ اپنے دشمنوں سے محبّت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دُعا مانگو تاکہ تم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے ٹھیرو (متی ۵: ۴۴ و ۴۵) ایک دلچسپ بات قابل لحاظ ہے کہ جب ہمارا خداوند مجموعی طور پر اپنی اُمت کا ذکر کرتا ہے تو وہ لفظ بادشاہت استعمال کرتا ہے مگر جب وہ اس بادشاہت کے اعلےٰ افسر کا ذکر کرتا ہے تو اس کو بادشاہ کے بجائے باپ کے نام سے نامزد کرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اپنے لوگوں کی تمام جماعت کی نسبت ہمارے خداوند کا خیال بادشاہت سے بڑھ کر کسی اَور لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کا مدعا نہ صرف یہ تھا کہ وہ اس بادشاہت کو اعلےٰ ترین برکت کا تصوّر بنانا چاہتا تھا۔ یعنی وہ اعلےٰ ہدف جس کی طرف اس کی اُمت کی تمام طاقتوں کا رُخ ہونا چاہیے بلکہ وہ اُسی کلیسیا یا مومنین کی جماعت کو بھی شامل کرنا چاہتا تھا۔ جو دُنیا میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے خاندان کی نسبت لفظ بادشاہت بہت زیادہ پُر معنی ہے اس کے استعمال سے وہ یہودیوں کے دلوں کی آرزوؤں اور خیالات کو بھی اس بادشاہت کی طرف کھینچنا چاہتا تھا لیکن اگر لفظ بادشاہ خدا کے لئے استعمال کیا جاتا خواہ یہودی سامعین کے کان اس لفظ سے بہت ہی مانوس تھے تو خدا کی ذات اور خصوصاً محبّت کی نسبت جس کو ہمارا خداوند اپنے شاگردوں کے دلوں میں قائم کرنا چاہتا تھا موزون نہ ہوتا +

(۸) سب کا باپ۔ ہمارے خداوند کی تعلیم میں خدا کو تمام بنی آدم کا باپ بھی کہا گیا ہے۔ خدا ناشکروں اور بدوں پر بھی مہربان ہے۔

(لوقا ۶ : ۳۵) وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راست بازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے مسرف بیٹے کی عمدہ تمثیل سے یہ بات سب سے بڑھ کر ظاہر ہوتی ہے۔ اس تمثیل میں وہ گنہگار جس نے خدا کی نعمتیں فضولخرچی میں برباد کردی ہیں۔ باوجود اس تمام ناخلفی کے ایک ایسا فرزند قرار دیا گیا ہے جس کے لئے باپ کا دل محبت سے بھرا ہوا ہے اور جو واپس آنے پر نہایت خوشی سے قبول کیا جاتا ہے۔ جو خیال مسرف بیٹے کو اُس کی ضرورت کے وقت واپس آنے پر آمادہ کرتا ہے وہ یہی ہے کہ میرا باپ اور گھر ہے اور جب وہ واپس آتا ہے تو اپنے باپ کی محبّت کو اپنے خیال سے بہت بڑھ کر پاتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ تمثیل اس موقع پر سُنائی گئی جب کہ فریسی اور فقیہہ ہمارے خداوند کے خلاف کُڑکُڑا رہے تھے کہ وہ محصول لینے والوں اور گنہگاروں کو قبول کرتا ہے ؛

(۹) خلاصہ۔ حاصل کلام ہمارا خداوند ہم کو سکھاتا ہے کہ سب سے پہلے خدا کو اپنا باپ سمجھیں۔ پھر اس باپ کو بادشاہ سمجھیں جو اعلٰے ترین بادشاہت پر حکمران ہے اس ابوی حکومت کی خاص صفت محبت ہے۔ مگر خدا کی ابویت کی وسعت اس کی سلطنت سے باہر بھی ہے کیونکہ خدا ناشکروں اور بدوں کا بھی باپ ہے۔ اس کی محبّت کی حدود ایسی وسیع ہیں کہ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جو اس بادشاہت کی مطلق پرواہ نہیں کرتے اور جنہوں نے باپ کے گھر میں بودوباش کرنے کی اعلیٰ برکت کو ترک کردیا ہے۔ لکھا ہے کہ خدا نے دنیا سے ایسی محبّت رکھی (یوحنّا ۳ : ۱۶)

یہ وسیع محبت نجات کا بنیادی اصول ہے۔ اس سے مسیح کی آمد کا مدعا معلوم ہو جاتا ہے وہ خدا کی محبّت کا اظہار کرنے والا ہے خدا نے دُنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اُس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا۔ یہ محبّت اس شخص کی زندگی کا اندرونی مدعا تھا جو کھوئے ہوئے کو ڈھونڈنے اور بچانے آیا۔ یہ وہ الٰہی صفت ہے جس کے باعث ننانویں راستبازوں کی نسبت ایک توبہ کرنے والے گنہگار کی توبہ پر آسمان میں خوشی ہو گی (لوقا ۱۵: ۷) اور جب یہ محبّت گنہگار پر غالب آجاتی ہے تو وہ ایک ایسے حلقہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ جس میں وہ خاص طور پر خدا کی ابویت کے زیر سایہ ہوتا ہے وہ ایک خاندان کا ممبر بن جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسی بادشاہت اور اعلےٰ انتظام کا جس میں بنی آدم اس ربّ عظیم کی محبّت کو محسوس اور معلوم کرتے ہیں۔ گنہگار کے ساتھ میل ہو جاتا ہے اور وہ بحال اور خوش کیا جاتا ہے آخر الامر خدا کی ابویت کا وہ تیسرا اور اعلےٰ درجہ ہے جو اس رشتہ سے متعلّق ہے جو باپ کے اور اس کے درمیان ہے۔ جو خاص معنی میں بیٹا کہلاتا ہے اسی تعلّق کے باعث مسیح کی زندگی اور موت خدا کی محبّت کا ایک عظیم مکاشفہ ہے اگر ہمارا خداوند باپ کے ساتھ کوئی نہایت قریبی تعلّق نہ رکھتا تو وہ کیونکر باپ کا مکاشفہ ہو سکتا تھا اور اس کی زندگی اور موت سے خدا کی محبّت کیونکر ظاہر ہو سکتی تھی اسی سے خدا کی محبت ظاہر ہوتی تھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخشدیا۔

چھٹا باب

بیٹا

(۱) ہمارے خداوند کا اپنی نسبت دعوے۔ ہمارے خداوند کی تعلیم کے دوسرے حصّے کا خاص مضمون اپنی ذات کے متعلق ہے۔ اس کی شخصیت کی نسبت یہ ایک عجیب حیرت انگیز معمّا ہے کہ ایک طرف تو فروتنی اس کی خاص الخاص صفت ہے۔ اور دوسری جانب وہ اپنی نسبت ایسے کلمات استعمال کرتا ہے جو اس سے پہلے یا پیچھے کسی کو استعمال کرنے کی جُرأت نہ ہوئی بعض اوقات یہ معما کسی ایک خاص قول میں پیش کیا جاتا ہے۔ فروتنی اور اپنی نسبت دعوے پہلو بہ پہلو رکھے جاتے ہیں مثلاً وہ فرماتا ہے کہ اے محنت اُٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ میں تمہیں آرام دونگا۔ میرا جوا اپنے اوپر اُٹھالو۔ اور مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن تو تمہاری جانیں آرام پائینگی (متی ۱۱: ۲۸و۲۹) جو شخص اس قسم کی دعوت دیتا اور اس قسم کا دعوے کرتا وہ فی الحقیقت ایک بڑا بھاری دعوے کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ کہتا ہے کہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے۔ کہ مذکورہ قول اُن الفاظ کے فوراً پیچھے مندرج ہے جن میں ہمارے خداوند کی شخصیت کی فضیلت کو نہایت اعلیٰ الفاظ میں ادا کیا گیا ہے یہ الفاظ اس نے خود فرمائے کہ میرے

باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا۔ سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے۔ اور اس کے جس پر بیٹا اُسے ظاہر کرنا چاہے (متی ۱۱ : ۲۷) یہ مقام اسی قسم کے بہت سے مقامات میں سے ایک ہے۔ ہمارے خداوند کا دعوےٰ جو وہ انسان کے دل اور زندگی پر رکھتا ہے۔ ہمیشہ ایسے طریق پر پیش کیا جاتا تھا۔ جس سے کچھ شک باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا شخص سمجھتا تھا جو انسان کی عزت اور تعظیم حاصل کرنے کا مستحق ہے۔ اگر خدائے قادر مطلق رعد کی کڑک میں آسمان سے بولے تو وہ انسانی اطاعت کا حق ان سے بڑھ کر الفاظ میں پیش نہیں کرسکتا (دیکھو متی ۱۰ : ۳۷ سے ۳۹ و ۱۶ : ۲۴ سے ۲۸ و ۱۹ : ۲۸ و ۲۹ و ۲۶ : ۳۱ - الخ نیز مرقس ۸ : ۳۴ سے ۳۸ و لوقا ۲۱ : ۱۰ سے ۱۹۔ اور یوحنّا کی انجیل شروع سے آخر تک خصوصاً ۵ : ۱۸ الخ و ۸ : ۱۲ الخ و ۱۰ : ۳۰ و ۱۴ : ۱۶ الخ)۔

(۲) ہمارا خداوند اپنے کو پیش کرتا ہے۔ مندرجہ بالا عجیب معما کا صرف ایک ہی صحیح حل ہے جسے مسیحی لوگ ہمیشہ سے پیش کرتے آئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مسیح خدا ہے وہ ثالوث کا مجسم اقنوم ثانی ہے کلام مجسم ہوا۔ اور اس نے ہمارے درمیان خیمہ کیا۔ اس اہم مسئلہ کو پیش کرنا اس وقت ہمارا مدعا نہیں ہے بلکہ ہم مسیح کی تعلیم کے اس حصہ پر غور کرنا چاہتے ہیں جس کا ذکر ہم کرکے آئے ہیں اس کی تعلیم کے اعلیٰ ترین مقاصد میں سے جو تصوّر اس نے اپنی نسبت اور اُس رشتہ کے متعلّق جو خدا اور انسان اور اس کے درمیان ہے پیش کیا وہ فی الحقیقت ایک نہایت ضروری اور اعلیٰ درجہ رکھتا ہے اگر وہ محض ایک معلم ہوتا تو یہ ہمارے

لئے اس وقت اول درجہ کی ضروری بات نہ ہوتی مگر جس طور پر اُس نے اپنی زندگی اور خدمت کے مدعا کو پیش کیا اس سے اس مضمون کی بھاری فضیلت ثابت ہوتی ہے اس لئے اگر ہم مسیح کے مقاصد کو کماحقہ سمجھنا چاہیں تو ضرور ہے کہ ہم اس مضمون کو ایک نہایت افضل درجہ پر رکھیں ؂

(۳) ہمارے خداوند کے اپنی نسبت مکاشفہ کا طریق

مندرجہ بالا بیان کو مدنظر رکھ کر یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہمارے خداوند نے خصوصاً اپنی خدمت کے ابتدائی حصہ میں اپنے آپ کو برملا طور پر مسیح ظاہر نہ کیا نہ اس نے اپنی ربوبیت کا دعوےٰ کیا۔ یہ اُس کا طریق عمل نہ تھا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ دعوےٰ کرنے کے بجائے اس نے اپنے مسیح اور خدا ہونے کو ظاہر کیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر وہ علاقہ گلیل کی ابتدائی خدمت کے زمانہ میں اپنے مسیح ہونے کا اعلان کرتا تو وہ عوام کے دلوں میں اشتعال پیدا کر کے اُن کو جوش میں لے آتا۔ ہمارا خداوند دیدہ و دانستہ اس قسم کے نتائج سے پہلو تہی کرتا تھا (یوحنا ۶: ۱۵) مگر اس کا معروف القابِ مسیح سے پہلو تہی کرنا عوام کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر ایک عمیق معنی بھی رکھتا تھا وہ جانتا تھا کہ ایمان کسی نام یا لقب کے ذریعہ موثر نہیں ہوتا۔ مگر جبکہ روح ایمان کے حقیقی مدعا کو تسلیم کر لیتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہمارے خداوند نے اپنی تعلیم میں اپنے مسیح اور خدا ہونے کو دعوے کے ذریعے پیش نہیں کیا۔ بلکہ اپنی الٰہی سیرت اور اختیار اور طاقت اور صداقت کے ظاہر کرنے سے۔ جب کبھی اس نے کوئی دعوےٰ اپنی نسبت پیش بھی کیا جس سے الوہیت ظاہر ہوتی تھی۔ تو اس کے الفاظ کسی ایسی صداقت کا مکاشفہ تھے جو اُس کے سامعین کو جاننا ازبس

ضروری تھا۔ اور محض کوئی خالی خولی دعوے اپنی نسبت نہ تھا۔ جو تعلق وہ خدا کے ساتھ رکھتا تھا۔ اس کے اندرونی احساس کے باعث وہ خدا کی بابت وہ باتیں بولتا تھا جو انسان کو اپنی زندگی کے لئے درکار تھیں اور جو لوگ اس کے کلام کو سنتے اور سمجھتے تھے ان کو اپنی شخصیت کی نسبت خود نتائج نکالنے دیتا تھا (دیکھو متی ۱۱ : ۲۷ و یوحنا ۵ : ۱۹ الخ) جس طریق سے وہ لفظ میرا باپ استعمال کرتا تھا اس طریق کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ بھی اس کا اسی قسم کا رویہ تھا یعنی وہ اُن کو یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں کون ہوں بلکہ یہ کہ وہ راستی کو اپنے لئے معلوم کریں (متی ۱۶ : ۱۲ سے ۲۰) ہمارے خداوند کی تعلیم میں اپنی نسبت بعض تصورات اولیٰ نہائت روشن ہیں ہم ان پر کچھ غور کریں گے +

(۴) ابن آدم۔ یہ وہ لقب ہے جس کو ہمارا خداوند اکثر اوقات اپنی نسبت ذکر کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے یہ لقب اُس نے خود اپنے لئے پسند کیا تھا اور اُس کے خاص تصوّر کو نہائت عمدگی سے ادا کرتا تھا اور گو وہ ہمیشہ خود اس کا استعمال کرتا ہے (یہ لقب اناجیل میں قریب اسّی مرتبہ آیا ہے) کبھی اور کسی شخص نے اُس کو اس لفظ سے یاد نہ کیا۔ یہ لقب اس خاص طریق کی ایک عمدہ نظیر ہے۔ جس سے وہ لوگوں کے سامنے آپنے آپ کو پیش کرتا تھا اور جس کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔ یہ نام اپنے آپ میں ایک معما اور ایک دعوت ہے۔ یہ لقب بطور تعریف کے نہیں بلکہ اس میں سے بطور استنباط کے مطلب اخذ کر سکتے ہیں ممکن ہے کہ وہ المسیح سے تعلّق رکھتا ہو۔ کیونکہ اس میں دانیل نبی کی کتاب کا وہ مقام یاد دلایا جاتا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ ایک شخص

آدم زاد کی مانند آسمان کے بادلوں کے ساتھ آیا اور قدیم الایام تک پہنچا اور سلطنت اُسے دی گئی (دانیل ۷: ۱۳ و ۱۴) مگر برخلاف اس کے وہ مسیح کا ایسا لقب سمجھا نہ جاتا تھا جس سے ہمارے خداوند کے مسیح ہونے کا دعوے ثابت ہو اس کی نسبت یہ سوال کیا جاتا تھا کہ یہ کون ابن آدم ہے (یوحنا ۱۲: ۳۴) یہ نام فی الحقیقت ہمارے خداوند کی پستی کا ایک نشان ہے مگر وہ خصوصاً اس کو ایسے موقعوں پر استعمال کرتا ہے جہاں اسکے جلال اور حشمت کا ذکر ہوتا ہے (دیکھو متی ۱۳: ۴۱ و ۱۹: ۲۸ و ۲۵: ۳۱؍ و ۲۶: ۶۴ و لوقا ۲۱: ۳۶ و یوحنا ۵: ۲۷ و ۶: ۶۲ وغیرہ) +

(۵) ہمارے خداوند کی انسانیت - ابن آدم کے لقب سے سب سے اول ہمارے خداوند کی انسانیت ظاہر ہوتی ہے اس امر کا اندازہ کرنا ناممکن ہے کہ ہر زمانہ کی مسیحی جماعت کے لئے یہ لقب کیسا بیش قیمت ثابت ہوا ہے - یہ بنی آدم کے ساتھ مسیح کی کامل اخویت کی نسبت اس کی اپنی شہادت ہے یہ نام جو خود مسیح کا پیارا اور اس کے اپنے خیال میں ایک خاص الخاص نام تھا۔ اس کے بہت سے قیمتی اقوال کے اندر چھپا رہتا تھا باوجود اس کے یہ فراموش کرنا ناممکن ہے کہ مسیح جو ہمیں بچانے آیا فی الحقیقت ہمارا بھائی تھا ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے خداوند نے اس لقب کو اپنے نجات کے کام کے ساتھ نہایت قریبی تعلق رکھنے والا ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیہ میں دے (متی ۲۰: ۲۸) اور پھر یہ کہ ابن آدم کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈنے اور نجات دینے آیا (لوقا ۱۹: ۱۰) +

(٦) اعلےٰ ترین آدمی۔ اکثر گمان کیا جاتا ہے کہ ہمارے خداوند نے اپنے تئیں ابن آدم ٹھیرانے سے انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ اور بنی آدم کا وکیل ظاہر کیا ممکن ہے کہ کوئی شخص اس خیال کو محض ایک زمانہ حال کا قیاس سمجھے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ عہدِ عتیق میں اعلےٰ ترین نمونہ کے اشخاص پائے جاتے ہیں بلکہ عہدعتیق کے خیالات کے مطابق یہ ایک عام بات ہے کہ بعض مشہور اشخاص کو بطور ایک اعلےٰ نمونہ کے رکھا جاوے اور ان کو ہر قسم کے لوگوں کا قائم مقام سمجھا جاوے۔ مثلاً ابرہام و موسےٰ و داؤد اور بہت سے اشخاص بطور نمونہ کے سمجھے جاتے تھے۔ یسعیاہ نبی کی کتاب کے آخری حصہ میں یہ خیال کا طریقہ تکمیل تک پہنچ گیا اس زمانہ میں اسرائیل کو بار بار یہوواہ اپنا خادم کہہ کر خطاب کرتا ہے جوں جوں یہ نبی آگے بڑھتا ہے یہ خیال بھی اُس کے ساتھ ہی ترقی کرتا جاتا ہے حتیٰ کہ ترپنؔ باب میں یہ تصوّر یہوواہ کا دُکھ اُٹھانے والا خادم کی صورت اختیار کرتا ہے جس کا مقابلہ اور یگانگت خدا کی اُمت کے ساتھ ظاہر کی جاتی ہے اس لئے یہ بات مان لینا خلاف قیاس نہیں ہے کہ جب ہمارے خداوند نے اپنے تئیں ابن آدم کہا تو اس کا مدعا یہ تھا کہ اپنے آپ کو تمام بنی آدم کا جانشین اور اعلےٰ ترین انسان کا نمونہ ٹھیرائے۔ اس میں جیسا کہ دیگر مقامات میں بھی ہمارا خداوند اپنے خیال کو ایک عالمگیر وسعت دیتا ہے وہ شریعت کو پورا کرتا ہے وہ یہودی خیالات کی تنگ حدود سے گذر کر تمام بنی آدم کو ایک حلقہ میں لے آتا ہے۔ چنانچہ نیک سامری کی تمثیل سے یہ بات ظاہر ہے ؛

(۷) ہمارے خداوند کا اعلےٰ نمونہ۔ اس کا نفی پہلو۔ مسیح

انسانیت کا اعلےٰ ترین نمونہ ہے کیونکہ اس میں خدا کا وہ مقصد جو انسان کے لیئے تھا پورا ہؤا۔ نفی پہلو سے وہ کامل شدہ انسان ہے۔ کیونکہ وہ ساری باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا۔ تاہم بے گناہ رہا۔ اپنی زمینی زندگی کے دوران میں وہ اخلاقی اور روحانی طور پر ترقی کرتا گیا اور جب کبھی بدی نے اس پر حملہ کیا وہ غالب آیا اس میں یعنی اس کی انسانی سیرت میں (اس وقت ہم مسیح کا بطور انسان کے ذکر کر رہے ہیں) پوری اور کامل ترقی اُس معراج تک پہنچ گئی ہے۔ جو خالق نے اس کے لئے ٹھیرائی تھی۔ اس کے دل اور زندگی پر گناہ کا مطلق اثر نہ ہؤا وہ خود اس امر سے ایسا واقف تھا کہ اپنے مخالفوں کو بے دھڑک کہہ سکتا تھا کہ مجھ میں کسی قسم کا عیب بتاؤ۔ چنانچہ اُس نے فرمایا کہ تم میں کون مجھ پر گناہ ثابت کرتا ہے (یوحنا ۸: ۴۶) اپنے عجیب روحانی احساس کی حالت میں اس کا یہ الفاظ استعمال کرنا نہایت وزن دار ہے اس کی روحانی آنکھیں نہایت روشن تھیں اور باوجود اس اندرونی بصارت کے اس نے اپنے میں ناپاکی یا ناکاملیت کا کوئی نشان نہ پایا وہ اپنے اندر سراسر نیکی اور راستی دیکھتا تھا۔ یہی احساس ہمارے خداوند کی تمام خدمت کے دَوران میں کئی اَور طریقوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اپنی اندرونی حالت کی نسبت مسیح کے ایسے الفاظ بلحاظ فلسفہ روح کے نہایت بیش قیمت ہیں۔ کیونکہ بڑے بڑے روحانی آدمیوں کی سوانح عمری شاہد ہے کہ اخلاقی احساس جس کے ساتھ حد درجہ کی نیکی ملی ہوئی ہو روح کو ایسا نازک بنا دیتا ہے کہ سیرت کے خفیف عیب بھی بہت بڑے نظر آتے ہیں +

(۸) مسیح کا کامل نمونہ (مثبت پہلو) اس پہلو سے بھی ہمارا خداوند انسانیت کا اعلےٰ ترین نمونہ ہے اپنی زندگی کے مدعا میں حد درجہ کی مصروفیت کے لحاظ سے اپنے درجہ کی راستی اور خلوص میں بڑے بڑے آدمیوں کے گناہوں کو مطعون ٹھیرانے میں اپنی مستقل بہادری کے ظاہر کرنے سے محتاج اور مصیبت زدوں کی مدد کے لئے ہمیشہ مستعد رہنے میں اپنی بیحد محبت اور خودنثاری میں یسوع مسیح ہمارے سامنے ایک ایسی انسانی سیرت میں نظر آتا ہے جو حد درجہ کی خوب صورت اور کامل ہے اس سیرت کی جو تاثیر بنی آدم پر اس وقت سے اب تک ہوئی ہے اس کا ذکر پیشتر کیا گیا ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ اگر مسیح خدا کا مکاشفہ ہے تو وہ انسان کا مکاشفہ بھی ہے اس نے انسانیت کے کامل تصوّر کو ظاہر کیا*

(۹) مسیح خدا کے اس ارادہ کو جو انسان کے حق میں ھے پورا کرتا ھے۔ ہمارا خداوند کامل شدہ انسان ہو کر ہمارے سامنے اپنی انسانی ذات میں تمام بنی آدم کا اعلےٰ وکیل ٹھیرتا ہے اس میں ہم خدا کا وہ مقصد جو انسان کی خلقت کی نسبت رکھتا تھا پورا ہؤا دیکھتے ہیں۔ مگر کوئی شخص اعتراض کر سکتا ہے کہ مسیح کی زندگی تو ایسی غم آلودہ تھی اس کی نسبت یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کیا خدا نے انسان کو دکھ اور درد کے بجائے خوش رہنے کے لئے پیدا نہیں کیا اس سوال سے بعض اعلیٰ غور طلب امور پیدا ہوتے ہیں۔ مسیح کی زندگی میں انسانیت کی کاملیت کے اعلےٰ تصوّر اور انسان کی اس معمولی زندگی کا اتحاد نظر آتا ہے جس میں ہر قسم کی کمزوریاں اور ناکامل نیکی پائی جاتی ہے نتیجہ اس

ملاپ کا بعینہ وہ ہے جو افلاطون نے اپنی ایک مشہور تصنیف میں پیشتر سے بیان کیا یعنی یہ کہ کامل نیک آدمی دنیا کے سامنے ناراست معلوم ہوتا ہے اور اس خیال سے وہ کوڑے کھائیگا شکنجے میں کھینچا جائیگا۔ پابجولان ہوگا اس کی آنکھیں جلاکر نکالی جائینگی اور آخر کار ہر قسم کی اذیّت سہکر وہ مصلوب ہوگا۔ یہ الفاظ بطور ایک پیشینگوئی کے معلوم ہوتے ہیں اس گُناہ آلودہ دنیا میں کامل انسان کو بدی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کو اذیّت سہنی پڑتی ہے۔ اس طور پر جو مصیبتیں مسیح نے اُٹھائیں وہ بنی آدم کا قائم مقام ہونے کی حیثیت میں اُٹھائیں۔ جس صداقت کو افلاطون نے اپنی عقل سے پہچانا وہ یسعیاہ نبی کے صحیفے کے آخری حصہ میں زیادہ عجیب طور پر بیان کی گئی ہیں اس میں اسرائیل کا اعلےٰ ترین تصور یہوواہ کے دُکھ اُٹھانے والے خادم کی صورت اختیار کرتا ہے وہ جس نے حقیقی اسرائیل کے گناہ اور غم اُٹھا لئے ایک نہائت شاندار صورت رکھتا ہے اس موقع پر اعلےٰ تصور اور حقیقت کے درمیان ایک ایسا صاف مقابلہ ہے اور حقیقی اسرائیل کی نجات کا تعلّق ایسا ضروری ہے کہ اس نبوت کو عجیب تکمیل سے جو ہمارے خداوند کی ذات میں پائی جاتی ہے۔ علیٰحدہ کرنا نہائت دشوار ہے اس امر پر غور کرنے سے لفظ ابن آدم کے معنی کو سمجھنا آسان ہے جیسا کہ نبی کی رویت میں خادم ان مقاصد کو جو خدا اپنے لوگوں کو نجات اور بہبودی کے لئے رکھتا ہے پورا کرتا ہے اسی طرح ابن آدم کے لقب میں یہ بات مفہوم ہے کہ مسیح میں خدا کے وہ مقاصد عظیم جو وہ تمام بنی آدم کے لئے رکھتا ہے پورے ہوتے ہیں؛؛

(۱۰) ابن اللہ - ہمارے خداوند نے یہ لقب اکثر استعمال نہیں دیکھا (دیکھو متی ۲۷ : ۴۳ و یوحنا ۵ : ۲۵ و ۹ : ۲۵) مگر وہ ہمیشہ اور خاص طور پر لفظ میرا باپ استعمال کیا کرتا تھا - جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ یہہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ خاص معنی میں ابن اللہ کہلانا میرا حق ہے - نیز اور لوگ اگر اکثر اُس کو اس نام سے پکارتے تھے (دیکھو متی ۴ : ۳ و ۸ : ۲۹ و ۱۴ : ۳۳ و ۲۷ : ۴۰ و ۴۳ و ۵۴ مرقس ۳ : ۱۱ لوقا ۲۲ : ۷۰ یوحنا ۱ : ۳۴ و ۴۹ و ۳ : ۱۸ وغیرہ) اس لقب کے مطالب کے لحاظ سے رسولوں کا قدرتی طور پر اس کو اختیار کرنا نہایت موزون تھا کیونکہ ایک تو یہ نہائت سادہ ہے اور نیز اس سے مسیح کی ذات کا راز جس سے وہ اور بنی آدم سے تشخیص کیا جاتا ہے - نہایت بآسانی ظاہر ہوتا ہے وہ قریبی تعلق جو مسیح کے باپ کے ساتھ رکھتا تھا اور جو اس کے ہر ایک دلی الفاظ سے ظاہر ہوتا تھا وہی اس راز کا حقیقی جوہر ہے (دیکھو متی ۱۰ : ۲۷)

(۱۱) ہمارے خداوند کی الوہیت - اسی مندرجہ بالا لقب سے ہمارے خداوند کی الوہیت سادہ ترین الفاظ میں ادا ہو سکتی ہے جو دقیق عقلی مشکلات مسیح کی الوہیت کی نسبت پیش آتی ہیں وہ جیسی اس لقب سے حل ہو سکتی ہیں کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتیں - جب کلام کا ذکر کیا جاتا ہے جیسا کہ یوحنا کی انجیل کے ابتدائی آیت میں ہے تو عقلی مشکلات فوراً شروع ہو جاتی ہیں یہی علم الٰہیات ہے جس سے گریز کرنا ناممکن ہے مگر لفظ ابن اللہ جو ہمارے خداوند نے استعمال کیا مذہبی ضروریات کے لحاظ سے اس کی الوہیت ظاہر کرنے کا سب سے عملی طریق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس لقب سے علم الٰہیات کے

تصوّرات کے بجائے نہائت مؤثر مذہبی تصوّرات کا سلسلہ پیدا ہو جاتا ہے جب ہم اپنے خداوند کے ابن اللہ ہونے پر غور کرتے ہیں تو سادہ مگر عجیب اور اطمینان افزا خیالات دل میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً خدا کی ابویت اور خاندان کا الٰہی انتظام کا نمونہ اور بیٹے کا باپ کا جانشین ہو کر باپ کے خیالات اور دل کو انسان پر ظاہر کرنیوالا ٹھیرنا +

(۱۲) ابن اللہ اور ابن آدم۔ قابل لحاظ ہے کہ یہ ہردو القاب ایک دوسرے کی معنی میں فرق کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے کا مطلب واضح کرتے ہیں ایک کے بغیر دوسرے کے نصف معنی رہجائینگے یہ کیوں ایسی عجیب بات ہے کہ ہمارے خداوند نے عادتاً اپنے تئیں ابن آدم کہنا پسند کیا۔ اس نے کیوں ایک ایسے نام پر زور دیا جو اس کی ظاہرا انسانیت کے لحاظ سے عام سامعین کی نظروں میں مضحکہ خیز تھا یقیناً اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ ابن اللہ بھی تھا اس کی الوہیت کی وجہ سے انسانیت پر زور دینا ضرور تھا دوسری طرف ابن اللہ کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جو ابن آدم اور فی الحقیقت ہمارا بھائی ہے وہ جو انسانوں کے درمیان انسان ہو کر رہا اور انسانیت کا نہایت کامل نمونہ ہے الٰہی ذات بھی رکھتا ہے۔ جب ان دونو القاب کو اس طور پر رکھا جاتا ہے تو اس سے خاص طریق ظاہر ہوتا ہے جس سے ہمارے خداوند نے اپنی ذات کو آشکارا کیا اسی طریق سے اُس نے لوگوں کو اپنی انسانیت اور ابویت کا سبق سکھانا پسند کیا کہ یہ دونو ذاتیں کیسی عجیب طور پر ایک شخص میں مل سکتی ہیں +

(۱۳) **تجسم**- ہمارے خداوند کی شخصیت کی نسبت وہ بھاری مسئلہ جس کو عموماً تجسم کہا کرتے ہیں اُنہی تصورات سے مستنبط ہوتا ہے جن پر ابھی غور کر آئے ہیں- جو تقریریں یوحنا کی انجیل میں پائی جاتی ہیں- اُن سے ہم پورے طور پر سیکھتے ہیں کہ ان ہر دو القاب ابن اللہ اور ابن آدم کے استعمال کا کیا مطلب تھا- ان تقریروں کے ذریعہ ہمارے خداوند نے تعلیم یافتہ یہودیوں کی نکتہ چینی کا مُنہ بند کیا اور اپنے شاگردوں کو ان گہری باتوں کی تعلیم دی جو ان کے لئے خاص طور پر درکار تھیں- ان دونوں قسم کے سامعین کے سامنے اُسے اپنی منزلت کو ثابت کرنا اور اپنے وسیع اختیار کی وجوہات بیان کرنا ضرور تھا- ہر دو امور میں آخری نتیجہ یہی تھا کہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بجا ثابت کیا جائے- مثلاً یوحنا کے پانچویں باب میں وہ کام میں اپنے آپ کو خدا باپ کا شریک ٹھیراتا ہے- وہ فرماتا ہے کہ میرا باپ اب تک کام کرتا ہے- اور میں بھی کام کرتا ہوں یہودیوں نے سمجھ لیا کہ وہ بڑا بھاری دعوےٰ کرتا ہے اور اپنے آپ کو خدا کے برابر بناتا ہے (آیت ۱۸) اس کے جواب میں ہمارے خداوند نے باپ کے ساتھ اپنے تعلق کی نسبت ایک بڑا دعوےٰ کیا (آیت ۱۹) محبت اور باہمی تعارف میں (آیت ۲۰) زندگی بخشنے میں (آیت ۲۱) عدالت میں (آیت ۲۲) بیٹا باپ کے ساتھ نہائت قریبی تعلق رکھتا ہے اور الٰہی اختیار سے کام کرتا ہے- سب کا فرض ہے کہ جیسا باپ کی عزت کرتے ہیں بیٹے کی عزت بھی کریں- جو بیٹے کی عزت نہیں کرتا- وہ باپ کی جس نے اُسے بھیجا- عزت نہیں کرتا (آیت ۲۳) بعد ازاں ابدی زندگی کا وہ عظیم وعدہ مندرج ہے جو مسیح کا کلام سُننے اور ایمان سے حاصل ہوتا ہے-

(آیت ۲۴) اور ایک ایسے وقت کا اعلان ہے۔ جب کہ مُردے خدا کے بیٹے کی آواز سُنینگے۔ اور جو سُنینگے وہ جئینگے کیونکہ جس طرح باپ اپنے آپ میں زندگی رکھتا ہے۔ اسی طرح اُس نے بیٹے کو بھی یہ بخشا کہ اپنے آپ میں زندگی رکھے۔ بلکہ اسے عدالت کرنے کا بھی اختیار بخشا۔ اس لیئے کہ وہ آدم زاد ہے (آیات ۲۵: ۲۶ و ۲۷) اس عجیب مقام سے مسیح کی اُلوہیت یا الٰہی ذات ایسے پُورے طور پر پائی جاتی ہے جیسی کسی اَور مقام میں نہیں ملتی۔ اس میں یہ تو نہیں کہ مسیح کو خدا کہا گیا ہو۔ مگر اس سے زیادہ حقیقی اور صحیح طور پر خاص الخاص الٰہی صفات ایک ایک کر کے بیٹے سے منسوب کی گئی ہیں۔ اس مقام میں شروع سے آخر تک باپ اور بیٹے کے درمیان ایک زندہ تعلق کا تصور پایا جاتا ہے جو بیٹے کی الٰہی طاقت کا دائمی سرچشمہ ہے اس مقام کے آخر میں دفعتہً بیٹے کی انسانیت کا جلوہ دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ ستائیسویں آئت میں مرقوم ہے۔ کہ اس لیئے کہ وہ آدمزاد ہے یہ نہایت قابل لحاظ امر ہے۔ اور اس میں تجسّم کی طرف صاف صاف اشارہ پایا جاتا ہے۔ اسی قسم کی تعلیم جس میں اُسی طرح ابن آدم کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یوحنا کی انجیل کے آٹھویں باب کی پچیسویں سے اُنتیسویں آیات (خصوصاً اٹھائیسویں آئت) میں مندرج ہے۔ اسی انجیل کے دسویں باب کی تیسویں آیت میں ہمارا خداوند ایک ہی چھوٹے سے فقرے میں اپنے اس اندرونی احساس کا بیان کرتا ہے۔ جو اپنے باپ کے ساتھ اس کے تعلّق کی نسبت ہے۔ اور جو بار بار اس کی اپنی نسبت تعلیم میں پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ مَیں اور باپ ایک ہیں۔ اسی احساس کا اظہار جو اس موقع پر اور دیگر مقامات میں موجود ہے۔ اس کی زندگی اور سیرت

کی عجیب ماہیت کے ساتھ ملا کر اس کی الوہیت کا سب سے پختہ ثبوت بنتا ہے (دیکھو متی ۱۱: ۲۷ یوحنا ۵: ۱۷ الخ و ۸: ۱۲ الخ وغیرہ)*

(۱۴) بیٹے کی پیش ہستی تجسم کا مسئلہ ان مقامات سے صاف صاف مترشح ہوتا ہے جن میں ہمارے خداوند نے اپنی پیش ہستی کا اظہار کیا۔ اس نے یہودیوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ تمہارا باپ ابراہیم میرا دن دیکھنے کی اُمید پر بہت خوش تھا۔ چنانچہ اُس نے دیکھا اور خوش ہوا۔ یہودیوں نے اُس سے کہا کہ تیری عمر تو ابھی پچاس برس کی نہیں پھر تو نے ابراہیم کو کس طرح دیکھا۔ یسوع نے ان سے کہا میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں۔ پیشتر اس سے کہ ابراہیم پیدا ہوا میں ہوں (یوحنا ۸: ۵۶ سے ۵۸) اور پھر یوحنا ۱۷: ۵ میں یوں آیا ہے۔ اب اے باپ تُو مجھے اپنے ساتھ اس جلال سے جو میں دنیا کی پیدائش سے پیشتر تیرے ساتھ رکھتا تھا جلالی بنا دے۔ اس قسم کے اقوال سے ظاہر ہے کہ ہمارا خداوند اس دُنیا کی انسانی حدود میں داخل ہونے سے پیشتر اپنے باپ کے ساتھ ایک جلالی الہی زندگی رکھتا تھا۔ ایک وقت رہ آیا۔ کہ جس میں اُس نے مجسم ہو کر ہمارے درمیان خیمہ کیا (یوحنا ۱: ۱۴)*

(۱۵) مسیح میں پیوستگی۔ جو تعلق خدا کے مجسم بیٹے اور اُس کے ان مومنین کی زندگی میں ہے جو اُس کی بادشاہت کے شرکا ہیں وہ خصوصاً اس بڑی تقریر کے بعض مقامات میں پایا جاتا ہے جو یوحنا کی انجیل کے آخری حصہ میں مندرج ہے۔ اس مضمون کا ذکر قدرتاً اس موقع پر کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے کہ یہاں پر ہمارا خداوند اپنے شاگردوں کے اندرونی حلقہ کو تعلیم دیتا اور آئندہ زمانہ کے لئے تیار

کررہا ہے۔ وہ اپنے تئیں خدا اور انسان کے درمیان گویا خط و کتابت کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے راہ اور حق اور زندگی میں ہوں۔ کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا (یوحنا ۱۴: ۶ نیز دیکھو یوحنا ۱۰: ۹) وہ اپنے تئیں اس اتحاد کا رشتہ ٹھیراتا ہے۔ جو اِنسان کو خدا سے اور دیگر بنی آدم سے پیوستہ کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ اس روز تم جانو گے کہ میں باپ میں ہوں۔ اور تم مجھ میں اور میں تم میں (یوحنا ۱۴: ۲۰) یہی حقیقت زیادہ وضاحت کے ساتھ انگور کی تمثیل میں پیش کی گئی ہے۔ اس نے فرمایا تم مجھ میں قائم رہو۔ اور میں تم میں۔ جس طرح ڈالی اگر انگور کے درخت میں قائم نہ رہے تو اپنے آپ سے پھل نہیں لاسکتی اِسی طرح تم بھی اگر مجھ میں قائم نہ رہو تو پھل نہیں لاسکتے۔ میں انگور کا درخت ہوں۔ تم ڈالیاں ہو۔ جو مجھ میں قائم رہتا ہے۔ اور میں اُس میں۔ وہی بہت پھل لاتا ہے۔ کیونکہ مجھ سے جدا ہو کر تم کچھ نہیں کر سکتے (یوحنا ۱۵: ۱۴ الخ) مسیح کا یہ یگانگت پیدا کرنے والا کام جس کے ذریعہ وہ خدا اور انسان میں اتحاد پیدا کرتا ہے۔ اور بنی آدم کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے اس کے تجسم کا ایک پہلو سمجھنا چاہیئے۔ یہ اس حقیقت کو پیش کرنے کا ایک طریق ہے۔ جو ابن اللہ اور ابن آدم دونوں القاب سے پیدا ہوتا ہے ٭

(۱۶) کفارہ۔ متی کی انجیل کے آغاز میں ہمارے خداوند کے نام کے معنی پر نہایت ضروری زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ کہ تو اس کا نام یسوع رکھنا کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو اُن کے گناہوں سے چھڑائیگا (متی ۱: ۲۱) [illegible] میں چروا ہے۔ فرشتے سے خبر پاتے ہیں

کہ داؤد کے شہر میں ایک منجی پیدا ہوا۔ یعنی مسیح خداوند۔ اس نجات کی ماہیت یوحنّا اصطباغی کی منادی میں زیادہ صاف طور پر بیان کی گئی ہے۔ دیکھو یہ خدا کا برّہ ہے۔ جو دنیا کا گناہ اُٹھا لے جاتا ہے (یوحنا ۱: ۲۹) ہمارے خداوند کی تعلیم کے ابتدائی حصّہ میں اس کے اس کام کی طرف بہت اشارہ پایا نہیں جاتا وہ ایسا نظر آتا ہے کہ گویا بادشاہت کی منادی کرنے اور اس کی ماہیت کا اظہار کرنے کے لئے آیا ہے۔ جو لوگوں کو توبہ کے لئے بلاتا ہے۔ جو بڑے بھاری اخلاقی سبق سکھلانے آیا ہے۔ جو دُکھ تکلیف اُٹھانے والوں کے لئے بیحد رحم سے معمور ہے اور اُن کے دُکھوں کو رفع کرنے کی عجیب طاقت رکھتا ہے۔ مگر وہ اوّل ہی اوّل اپنے آپ کو بطور خدا کے برّے کے جو دنیا کا گناہ اٹھا لیجاتا ہے۔ صاف طور پر ظاہر نہیں کرتا۔ اور یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے خداوند کی تعلیم اور اپنی نسبت مکاشفہ تدریج تھے۔ وہ لوگوں کی قابلیّت کے مطابق اُن کو سکھاتا تھا اور کام اور کلام کرنے کے لئے عین موقع کا منتظر رہتا تھا*

(۱۷) یوحنّا کی انجیل کے چھٹے باب میں کفارہ کی طرف اشارہ۔ جب عین موقع آپہنچا۔ ہمارے خداوند کی تقریریں اپنی موت اور نجات کے اسی کام کی نسبت جو وہ پورا کرنے کو تھا۔ نہائت صاف صاف الفاظ میں کی گئیں۔ اُن میں سے ایک ابتدائی زمانہ کی تقریر یوحنّا کی انجیل کے چھٹے باب میں مندرج ہے۔ ایک بڑی جماعت کو عجیب طور پر سیر کیا گیا تھا۔ اس معجزہ کو ایک سند کی آیت قرار دیکر اس پر ہمارے خداوند نے اپنی نسبت اور اپنی شخصیت اور کام کے مدعا کی

بنیاد رکھی۔ اُس نے اپنے آپ کو اپنے سامعین کے سامنے بطور زندگی کی روٹی کے جو آسمان سے اُتری پیش کیا۔ یہ معجزہ عید فسح کے ایام کے قریب واقع ہوا (یوحنا ۶: ۴) موقع کی موزونیت کے لحاظ سے زندگی کی روٹی کے خیال کے ساتھ جس میں بیابان کے مَن کی طرف اشارہ ہے (آئت ۳۱) فسح کے برّہ کا خیال بھی داخل کیا گیا ہے۔ جس کا گوشت عید کے شرکا کھایا کرتے تھے۔ اس نے فرمایا جو روٹی میں جہان کی زندگی کے لئے دونگا وہ میرا گوشت ہے (آیت ۵۱) اس دعوٰی کی نسبت عوام میں بہت سا جھگڑا ہوا۔ اس پر ہمارے خداوند نے اس نمونہ پر اَور بھی زیادہ زور دیا۔ اور اپنے گوشت کے ساتھ اپنے لہو کا بھی ذکر کر کے یہودیوں کو سخت حیرت میں ڈال دیا۔ چنانچہ اُس نے فرمایا میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جب تک تم ابن آدم کا گوشت نہ کھاؤ اور اُس کا خون نہ پیو تو میں زندگی نہیں۔ جو میرا گوشت کھاتا اور میرا خون پیتا ہے۔ ہمیشہ کی زندگی اُسی کی ہے۔ اور میں اُسے آخری دن پھر اُسے زندہ کرونگا (آیات ۵۳ و ۵۴) اس مقام میں جو کچھ اور تعلیم ہو یقیناً اوّل سبق یہی ہے۔ کہ ہمارا خداوند جہان کی زندگی کے لئے اپنے جسم کو موت کے حوالہ کر دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے تئیں فسح کا برّہ قرار دیتا تھا۔ جس کی موت اور خون بہانے سے خدا کے لوگ موت سے نجات پانے کو تھے۔ اس نے خود صاف صاف بیان کیا کہ میرے الفاظ روحانی مطلب رکھتے ہیں (دیکھو آیت ۶۳) جب ہم اس کی مابعد کی تعلیم کی طرف جو اپنی موت کی نسبت ہے متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے +

(۱۸) یوحنا کی انجیل کے دسویں باب میں کفارہ کی تعلیم۔ اس باب میں جہاں ہمارے خداوند نے اپنے آپ کو اچھا چرواہا قرار دیا۔ اس کی موت کے مطلب اور حالات کا نہائت صاف بیان ہے۔ اس نے فرمایا کہ اچھا چرواہا میں ہوں۔ اچھا چرواہا بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہے (آیت ۱۱) اور پھر ۱۴ و ۱۵ آیات میں کہا کہ اچھا چرواہا میں ہوں۔ جس طرح باپ مجھے جانتا ہے۔ اور میں باپ کو جانتا ہوں اسی طرح میں اپنی بھیڑوں کو جانتا ہوں۔ اور میری بھیڑیں مجھے جانتی ہیں۔ اور میں بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہوں۔ بعد اس کے اُن خاص حالات کا بیان ہے جنکے مطابق وہ قربانی ہونے والی تھی۔ "میں اپنی جان دیتا ہوں تاکہ اُسے پھر لے لوں۔ کوئی اُسے مجھ سے چھینتا نہیں۔ بلکہ میں اُسے آپ دیتا ہوں مجھے اس کے دینے کا بھی اختیار ہے اور اس کے پھر لینے کا بھی اختیار ہے۔ یہ حکم میرے باپ سے مجھے ملا"۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جو اپنی جان انسان کی خاطر قربانی کرنے کو تھا وہ اپنے ارادے اور مرضی سے کرنے کو تھا +

(۱۹) مسیح کے اقوال اپنی موت کی نسبت۔ اپنی موت سے پیشتر آخری مرتبہ یروشلیم کو جاتے ہوئے ہمارے خداوند کا دل آنے والے دہشت ناک واقعات سے بہت بھرا ہوا تھا۔ اس نے دیدہ و دانستہ اس موقع پر اپنے شاگردوں کو آنے والی باتوں کی خبر دی اور ان کو تیار کیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ اس نے پھر ان بارہ کو لے کر ان سے وہ باتیں کہنی شروع کیں جو اس واقعہ پر ہونیوالی

تھیں۔ دیکھو ہم یروشلیم کو جاتے ہیں۔ اور ابن آدم سردار کاہنوں اور فقیہوں کے حوالہ کیا جائیگا اور وہ اس پر قتل کا حکم دینگے۔ اور اُسے غیر قوموں کے حوالہ کرینگے۔ اور وہ اسے ٹھٹھوں میں اُڑائینگے اور اُسے تھوکینگے اور اُسے کوڑے مارینگے۔ اور قتل کرینگے۔ اور تین دن کے بعد وہ جی اُٹھیگا (مرقس ۱۰: ۳۲ و ۳۳ و ۳۴) یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ اس نے ان کو بتایا کہ میری موت کیونکر واقع ہو گی۔ جب مقدس پطرس نے اس کے مسیح ہونے کا اقرار عظیم کیا۔ تو اس کے بعد ہی مسیح نے اپنی موت کی خبر دی۔ اور بعد ازآں بھی وقتاً فوقتاً وہ ان کے ساتھ اسی مضمون کا تذکرہ کیا کرتا تھا لکھا ہے کہ اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر یہ بات ظاہر کرنے لگا۔ کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلیم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دُکھ اُٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں اور تیسرے دن جی اُٹھوں (متی ۱۶: ۲۱ نیز دیکھو مرقس ۸: ۳۱ و ۹: ۳۱ و لوقا ۹: ۲۲ و ۱۸: ۳۱) +

(۲۰) قانون فدیہ۔ ممکن ہے کہ کوئی یہ خیال کرے کہ مقامات مندرجہ بالا محض چند واقعات کی پیشین گوئیاں ہیں۔ مگر ان میں ان واقعات کا مطلب بیان نہیں کیا گیا۔ ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کی موت گناہ کا فدیہ ہونے کو تھی۔ گو اِن حوالہ جات میں کفارہ کی طرف صاف صاف اشارہ نہیں ہے۔ مگر یہ ایک عجیب بات ہے کہ ان کے بعد ہی فدیہ کے قانون عظیم کی تعلیم نہائت زور سے دی گئی ہے۔ جب ہمارے خداوند نے اپنے یہودیوں سے رد کئے

جانے اور موت کی خبر دی تو پطرس اس کو الگ لیجا کر اُسے ملامت کرنے
لگا کہ اے خداوند خدا نہ کرے یہ تجھ پر ہرگز نہیں ہونے کا اس نے پھر
پطرس سے کہا اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو جا تو میرے لئے
ٹھوکر کا باعث ہے کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں
کا خیال رکھتا ہے۔ اس کے بعد ہمارا خداوند اپنی قریب آنے والی
مصلوبیّت کو بطور ایک تمثیل کے رکھ کر شاگردوں کو سکھاتا ہے کہ اگر
تم میرے حقیقی شاگرد ہونا چاہتے ہو۔ تو میرے نمونہ کی پیروی کرو اور
قانون فدیہ کو مانو۔ چنانچہ اُس نے فرمایا کہ اگر کوئی میرے پیچھے آنا
چاہے تو اپنی خودی سے انکار کرے اور اپنی صلیب اُٹھا کر میرے
پیچھے ہولے۔ کیونکہ جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے گا۔ اُسے کھوئے گا
اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئیگا وہ اسے پائیگا (متی ۱۶: ۲۲ تا آخر)
اس مقام سے ظاہر ہے کہ اس قانون کو پیش کرتے ہوئے ہمارا
خداوند اپنے کام اور زندگی کی تشریح کر رہا تھا جو بھاری مدعا اس
کے سامنے درپیش تھا وہ اس کو قربانی کے ذریعہ سے سرانجام دینے
والا تھا۔ اپنی خودی سے انکار کر کے اپنی صلیب اٹھا کر اور اپنی جان
کے کھونے سے وہ انسان کی نجات کا کام پورا کرنے والا اور اپنی
بادشاہت کو قائم کرنے والا تھا۔ جو تعلیم اُس نے اپنے شاگردوں کو
دی اُس کی بنیاد خود اپنا ہی نمونہ تھا +

(۲۱) زبدی کے بیٹوں کی درخواست۔ جو تفسیر ہم نے
اپنے خداوند کے الفاظ کی یہاں کی ہے اس کی صحت کا قاطع ثبوت
اس آیت سے پایا جاتا ہے جو اُس نے اپنے شاگردوں کو یعقوب

اور یوحناؔ کی بے موقع درخواست کے بعد دی۔ وہ اس وقت یروشلیم کی طرف آخری سفر میں تھے۔ جیساکہ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں۔ ہمارے خداوند نے اپنی موت کے حالات کا نہایت صاف بیان کر دیا تھا۔ بعد ازآں زبدی کے دونوں بیٹوں اپنی ماں کو ساتھ لیکر اس کے پاس آئے ان کے دلوں میں دُنیاوی جاہ و جلال اور بڑے شان و شوکت کے درجوں کی جن کو حاصل کرنے کی وہ اُمید رکھتے تھے آگ مشتعل ہو رہی تھی۔ اور ان کی آرزو یہ تھی کہ ان کے ساتھ بادشاہت میں اعلےٰ رتبہ کا وعدہ کیا جائے (متی ۲۰: ۲۰ الخ) مگر یسوع نے جواب میں کہا تم نہیں جانتے کہ کیا مانگتے ہو جو پیالہ میں پینے کو ہوں کیا تم پی سکتے ہو؟ انہوں نے اس سے کہا پی سکتے ہیں۔ اس نے ان سے کہا میرا پیالہ تو پیوگے لیکن اپنے داہنے بائیں کسی کو بٹھانا میرا کام نہیں۔ مگر جن کے لئے میرے باپ سے تیار کیا گیا۔ انہیں کے لئے ہے۔ اس مقام میں پھر اس ہولناک قربانی کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ بادشاہت حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ باقی شاگرد یعقوب اور یوحناؔ سے خفا ہوئے کیونکہ ان کے دل ہنوز بادشاہت کے دنیاوی خیال کی قید سے آزاد نہ ہوئے تھے ان کو یہ سیکھنا باقی تھا کہ خدا کی بادشاہت میں بڑائی کس کو کہتے ہیں۔ چنانچہ یسوع نے انہیں پاس بلا کر کہا تم جانتے ہو کہ غیر قوموں کے سردار ان پر حکومت چلاتے اور امیر ان پر اختیار جتاتے ہیں۔ تم میں ایسا نہ ہوگا۔ بلکہ جو تم میں بڑا ہونا چاہے وہ تمہارا خادم بنے۔ اور جو تم میں اوّل ہونا چاہے وہ تمہارا غلام بنے۔ بعد ازاں اُس نے اپنے

نمونے کو پیش کر کے یہ فرمایا کہ ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیہ میں دے۔

(۲۲) کفارہ کا بیان۔ اس آخری حوالہ میں جو ابھی پیش کیا گیا ہے۔ کفارہ کا ایسا پورا اور ٹھیک بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کتاب مقدس میں اور کہیں پایا نہیں جاتا۔ اس میں اتفاقی طور پر کفارہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مگر یہ ایسا صاف اور پُر معنی ہے کہ اس میں ذرا بھی شک نہیں۔ کہ ہمارے خداوند نے دیدہ و دانستہ اپنے اس نجات کے کام کی نسبت جو ہونے والا تھا یہ الفاظ استعمال کئے۔ اس طریق کا رُخ اس وقت رسولوں کے خیالات کے میلان سے بالکل نقیض تھا۔ وہ وقت اب آگیا جب ان کو صاف صاف بتانا ضرور تھا کہ صرف میری موت کے ذریعہ میرا کام پورا ہونا۔ میرے مشن کی تکمیل اور میری بادشاہت کا قائم ہونا ممکن ہے۔ اگر تم حقیقی شاگرد اور بادشاہت کے لائق ممبر ہاں بلکہ اگر تم بادشاہت میں بڑا ہونا چاہو تو جو طریق قربانی اور خدمت کا تمہارے اُستاد نے اختیار کیا وہی تم بھی کرو۔ اس لئے یہ ضرور تھا کہ اُن کو معلوم ہو جائے کہ وہ قربانی اور خدمت کیا ہے۔

(۲۳) نجات۔ اس موقع پر مسیح کا کام جو اس نے انسان کے لئے کیا وہ نجات کہلاتا ہے۔ اس نے اپنی جان فدیہ میں دی۔ وہ مُوا۔ تاکہ بہتیرے نجات پا دیں۔ عموماً یہ فراموش کیا جاتا ہے۔ کہ ہمارے خداوند کی موت کے مدعا کا یہ بیان یہودی شاگردوں کو ہماری نسبت بہتر طور پر سمجھ میں آسکتا تھا۔ اسی زمانہ میں کوئی شخص اپنے کاروبار

میں فدیہ دینے کا خیال نہیں کرتا۔ مگر یہودی خیالاً و فعلاً چھٹکارے کا
نہائت وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ غلاموں۔ قیدیوں۔ پہلوٹھوں اور خود
اپنی جان کے لئے فدیہ دیا جاتا تھا۔ ان کے ذریعہ موت سے چھٹکارا
حاصل ہوتا تھا اور الٰہی غضب ٹل جاتا تھا (دیکھو خروج ۱۳: ۱۳ و ۳۰:
۱۲ سے ۱۶ و ۳۴: ۲۰ و احبار ۲۵: ۲۵۔ الخ و ۴۷ الخ گنتی ۱۸: ۱۵ و ۱۵:
۳۱ وغیرہ) اس لئے جب ہمارے خداوند نے یہ دعوے کیا کہ میں اپنی
جان بہتیروں کے بدلے فدیہ میں دینے کو آیا ہوں۔ تو سامعین نے
اس کے الفاظ کو بخوبی سمجھ لیا ہوگا*

(۲۴) عشائے ربانی و کفارہ۔ ہنوز ان مقامات پر غور کرنا
باقی ہے۔ جن میں ہمارے خداوند نے اپنی موت سے پیشتر اس کے
مدعا کا ذکر کیا۔ ان میں سب سے ضروری وہ مقام ہے جس میں عشائے
ربانی کی رسم کے جاری کرنے کا بیان ہے۔ اس موقع کی سنجیدگی تمام
حالات کا وزن دار ہوتا جو کام ہونے والا تھا اس کی یادگار میں ایک
متبرک رسم کا قائم کرنا ایسے امور تھے جن سے اس موقع کے الفاظ
کی عجیب اور اشد ضرورت ظاہر ہوتی ہے۔ عہد جدید میں اسی موقع
کے چار بیانات پائے جاتے ہیں (متی ۲۶: ۲۶ سے ۲۸ و مرقس
۱۴: ۲۲ سے ۲۴ و لوقا ۲۲: ۱۹ و ۲۰ و ا قرنتیوں ۱۱: ۲۳ سے ۲۵)
ان میں سے کوئی دو بیانات سراسر مطابق نہیں ہیں۔ مگر ایک بات
میں سب متفق ہیں کہ ہمارے خداوند نے اس رسم کا رشتہ اپنی موت
کے تصوّر کے ساتھ جو انسان کے لئے بطور فدیہ کے اختیار کرنے کو
تھا منسلک کر دیا ہے۔ اس کا بیان لوقا نے نہایت وضاحت کے

ساتھ کیا ہے۔ کیونکہ جو بیان اس نے قلمبند کیا ہے۔ اس میں یہ
خیال روٹی اور مے کے استعمال کے ساتھ دو دفعہ آیا ہے۔ چنانچہ
لکھا ہے کہ یہ میرا بدن ہے جو تمہارے واسطے دیا جاتا ہے۔ اور پھر
کہ یہ پیالہ میرے اس خون کے سبب سے نیا عہد ہے جو تمہارے
واسطے بہایا جاتا ہے۔ مگر مقدس متی گو ہمارے خداوند کے ایک
ہی مرتبہ فدیہ کا ذکر کرنا بیان کرتا ہے اپنے بیان کو زیادہ مفصّل
طور پر پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس مقام میں یوں لکھا ہے کہ پھر پیالہ
لیکر شکر کیا اور انہیں دیکر کہا کہ تم سب اسی میں سے پی لو کیونکہ یہ
میرا خون ہے یعنی عہد کا وہ خون جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی
معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے۔ مرقس کا بیان متی کے مطابق ہے
مگر زیادہ مختصر ہے۔ وہ گناہوں کی معافی کا ذکر نہیں کرتا مگر اس
امر کا ذکر کرتا ہے کہ مسیح کا خون بہتیروں کے لئے بہایا جاتا ہے
مقدس پولس کے بیان میں یہی خیال ان الفاظ میں مندرج ہے
کہ یہ میرا بدن ہے جو تمہارے لئے توڑا جاتا ہے (۱ قرنتیوں ۱۱:۲۴)
غرض ان سب بیانات میں ہمارے خداوند کی موت کے فدیہ ہونے
کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نے اپنے جسم کو موت کے حوالہ کیا اور اپنا
خون بہایا تاکہ بہتیروں کا گناہوں سے چھٹکارا ہو۔ اور اس نے ایک
سنجیدہ رسم بھی مقرر کر دی جس کے ذریعہ اس کے شاگرد اسکی بھاری
قربانی کو ہمیشہ یاد رکھیں ÷

(۲۵) **محبت اور قربانی**۔ یہاں پر ایک اور مقام کا ذکر کرنا
ضرور ہے۔ اسی رات متبرک عشاء کے بعد ہمارے خداوند نے اپنے

شاگردوں کی طرف مخاطب ہو کر وہ عجیب کلمات زبان سے فرمائے
جو مقدس یوحنا کی انجیل کے چودھویں پندرھویں اور سولھویں ابواب
میں مندرج ہیں۔ اب پیار کرتے ہوئے جو ان کو آپس میں ایکدوسرے
کے ساتھ رکھنا ضرور تھا اس نے فرمایا کہ میرا حکم یہ ہے کہ جیسے میں نے
تم سے محبت رکھی تم ایکدوسرے سے محبت رکھو اور مسیح نے اپنوں
کے ساتھ کس طرح محبت رکھی۔ لکھا ہے کہ اس سے زیادہ محبت
کوئی شخص نہیں کرتا کہ اپنی جان اپنے دوستوں کے لئے دیدے +

(۲۶) ہمارے خداوند کی تعلیم میں کفارہ کی منزلت

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ خود ہمارے خداوند نے نہایت صفائی
سے یہ تعلیم دی کہ کفارہ میری موت کے ذریعہ سے ہوگا جو حوالجات ہم نے
ابھی پیش کئے ہیں اور جن میں حد درجہ کی سنجیدگی پائی جاتی ہے ان
سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کا انسان کی جان کی خاطر مرنا ایک ایسا
امر نہیں تھا جو واقع کے بعد مسیحیوں نے گھڑ لیا ہو۔ کفارہ کی تعلیم ہمارے
خداوند کی تعلیم اور خدمت کا جزو اعلےٰ تھی۔ بلکہ اس کو مسیح کی خودنثاری
کی زندگی کی بھاری قربانی کا معراج سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ کفارہ مسیح
کے خیالات میں بھی اعلےٰ منزلت رکھتا تھا۔ کفارہ کو تجسم کے پہلو
بہ پہلو رکھنا چاہیئے۔ اور یہ دونوں ہمارے خداوند کی اس دینی تعلیم
کے جو اس نے اپنی نسبت دی اعلےٰ ترین تصورات تھے۔ ان دونو
کی تعلیم علم الٰہیات کے طور پر نہیں بلکہ مذہبی طور پر دی گئی۔ اُستاد
اعظم جانتا تھا کہ اُن کو ایسے طور پر پیش کرنا چاہیئے کہ انسان کے
دل میں استدلال کا سلسلہ قائم کرنے سے پیشتر اس کی زندگی پر تاثیر

پیدا کریں۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہمارے خداوند نے ان خیالات کو ایسی طرز پر رکھا جن سے منطقی تعریفوں کا کچھ تعلّق نہیں انسان کے مذہب اور زندگی کی خاطر یہی انسب تھا کہ اُستاد اپنی حکمت سے تعریفوں کا زمانہ بہت مدت کے بعد قائم ہونے دے۔ اسی نے انسان کو زندہ صداقت بخشی اور اسی بنیاد پر علم الٰہیات کا سلسلہ قائم ہوا۔

(۲۷) کفارہ کی نسبت ہمارے خداوند کی تعلیم کا خلاصہ

ہمارے خداوند کی تعلیم میں کفارہ سے مراد اس نجات سے ہے جو انسان مسیح کی موت کے ذریعہ گناہ سے حاصل کرتا ہے۔ یہ ہے گناہوں کی معافی جو مسیح کی موت اور خون بہانے سے ملتی ہے یہ محبّت کا اظہار ہے۔کیونکہ محبت اپنے آپ کو اس قربانی سے بڑھ کر ظاہر نہیں کر سکتی جس سے انسان اپنی جان اپنی دوستوں کے لئے قربان کر دیتا ہے یہ ہے جان کو کھونا تا کہ اس کو حاصل کیا جائے۔ یہ ہے گیہوں کا دانہ جو مرنے کے لئے زمین میں گر جاتا ہے اور موت کے ذریعہ بہت سا پھل لاتا ہے (یوحنا ۱۲: ۲۴) یہ مسیح کی زندگی کے بھاری مُدعا کی پوری تکمیل کے لئے ایک ضروری قدم ہے۔ وہ اس لئے ظاہر ہوا کہ ابلیس کے کاموں کو مٹائے (۱یوحنا ۳: ۸) اور راستبازی اور محبت کی بادشاہت ہمیشہ کے لئے قائم کرے اور یہ مدعا فقط کفارہ ہی کے ذریعہ سے پورا ہو سکتا تھا۔

(۲۸) بدی کے ساتھ مقابلہ۔ ہم پیشتر ازیں اپنے خداوند کا خیال گناہ کی نسبت کچھ نہ کچھ معلوم کر چکے ہیں۔ اس کے نزدیک یہ ایک ایسی ہولناک شے ہے۔جس کا قیاس بھی ناممکن ہے۔ یہ محبت اور خدا کا

دشمن عظیم ہے۔ یہی بادشاہت کی آمد کو روکنے والا ہے۔ اس کی صداقت کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اسی امر پر غور کرنا چاہیئے کہ ہمارے خداوند کی زندگی اپنے روحانی تجربوں سے ویسی ہی ظاہر ہوتی ہے جیسی کہ اُس کے الفاظ سے ہوتی ہے۔ اس کی زندگی بدی کے ساتھ ایک لگاتار مقابلہ تھا اس کو ایک بڑی بھاری طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا جو اس کی زندگی کے کام کی مخالف تھی۔ یہ مقابلہ اس کے امتحان کے بیان سے نہایت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔ مگر اس کا ذکر وقتاً فوقتاً اس کے تمام دوران خدمت میں اس کی موت تک پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بعضے نظائر اُس کے آزمائے جانے کے بیان سے بھی زیادہ پُرزور اور پُر معنی ہیں۔ مثلاً جب ہمارے خداوند نے ایک موقع پر اپنے دُکھ اور موت کا نہائت سنجیدہ اعلان کیا تو پطرس نے اپنے پُرجوش طرز میں کہا کہ ناممکن ہے کہ خدا کا مسیح اس طور پر دُکھ اُٹھائے اور مرے۔ تب ہمارے خداوند نے مُڑ کر اپنے رسول کو غضب آلودہ الفاظ میں کہا کہ اے شیطان میرے سامنے سے دُور ہو جا تو میرے لئے ٹھوکر کا باعث ہے کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے۔ (متی ۱۶: ۲۲ الخ) جو خیال پطرس نے اپنے خداوند کے سامنے پیش کیا وہ بظاہر ایک معمولی اور پُرزور امتحان تھا۔ یعنی یہ کہ مسیح اپنے اعلےٰ منزلت کا خیال کر کے موت کی پستی اور عذاب سے منہ موڑ لے۔ یہ ایک نہایت غضب کا پُرزور کلمہ ہے کہ اے شیطان میرے سامنے سے دُور ہو جا۔ یہ خداوند کے دل کے اندر سے نکلا کیونکہ اس نے معلوم کیا کہ میرا اپنا رسول سب سے مہلک آزمایش کا ذریعہ

بن گیا ہے۔ جب وہ امتحان پر غالب آیا تو اُس نے اپنے رُوحانی تجربے کی گہرائی میں سے قانون قربانی کا یہ اعلےٰ بیان پیش کیا کہ جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے اُسے کھوئیگا ؎

(۲۹) ہمارے خداوند کا اپنی موت سے دہشت زدہ ہونا۔ جوں جوں تصلیب کا وقت نزدیک ہوتا گیا۔ اُس بھاری رُوحانی کشمکش کا اظہار بڑھتا گیا۔ یوحنا کی انجیل کے بارھویں باب میں یونانیوں کی آمد کے بعد ہی ہمارے خداوند کا عمل اور کلمات کا نہائت موثر بیان مندرج ہے (۲۱ و ۲۲ آیت) اس نے اپنی موت کو اپنا جلال قرار دیا (آیت ۲۳) اور پھر قربانی کے اصول کی تعلیم دی (۲۴ و ۲۵ آیات) بعد ازآں دفعۃً کوئی ایسی تبدیلی واقع ہوئی کہ وہ گویا سخت عذاب میں ہو کر خدا کی طرف پکار کر یوں بول اُٹھا کہ اب میری جان گھبراتی ہے۔ پس میں کیا کہوں۔ اے باپ مجھے اس گھڑی سے بچا۔ لیکن میں اسی سبب سے تو اس گھڑی کو پہنچا ہوں۔ اے باپ اپنے نام کو جلال دے۔ اس آنے والی موت میں کوئی ایسی دہشت تھی جو ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ اس کے لئے یہ بدی کی طاقتوں کے ساتھ مقابلہ تھا۔ کیونکہ تھوڑی دیر بعد جب اس کا اپنے باپ کے ساتھ پورے اطمینانِ قلب کا رشتہ پھر قائم ہو گیا تو اس نے فرمایا اب دنیا کی عدالت کی جاتی ہے۔ اب دُنیا کا سردار نکال دیا جائیگا ؎

(۳۰) باغ میں نزع کی حالت۔ مگر شاید سب سے بڑھکر ایک قابل لحاظ وہ موقع ہے جب مسیح باغ میں نزع کی حالت میں تھا۔ اس وقت شرمناک صلیبی موت کی اذیت سے پہلوتہی کرنے کا سخت امتحان

صاف طور پر پایا جاتا ہے اور روحانی جنگ کی شدّت جو اس امتحان سے پیدا ہوئی۔ جسمانی تاثیرات اور اس دُعا سے جو بار بار مانگی گئی ظاہر ہوتی ہے۔ کہ اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔ (متی ۲۶ : ۳۹) اس عذاب کی حالت میں وہ ادھر اُدھر اپنے بے پرواہ اور اُونگھتے ہوئے رسولوں سے ہمدردی طلب کرتا پھرتا تھا۔ اور پھر واپس اُسی دُعا کے مقام پر اپنا دل اپنے باپ کے آگے اُنڈیل دیتا تھا۔ آخرکار۔ اس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ تیری مرضی پوری ہو۔ اس قسم کے نظارہ سے ہم اس کے چند مختصر الفاظ کو سمجھ سکتے ہیں۔ جو اس کی خدمت سے اسی حصہ سے متعلّق ہیں۔ مثلاً دنیا کا سردار آتا ہے اور میرے پاس اس کا کچھ نہیں (یوحنا ۱۴ : ۳۰) یہ تمہاری گھڑی اور ظلمت کا اختیار ہے (لوقا ۲۰ : ۵۳) ان مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا خداوند صلیب کو جس کے رُخ وہ جا رہا تھا بدی کی طاقتوں کے ساتھ لمبے جنگ میں آخری مقابلہ سمجھتا تھا۔ ان طاقتوں پر وہ آخرکار پورے طور پر غالب آیا۔ اُس نے اپنی جان دیکر فتح حاصل کی ✣

(۳۱) روح القدس کے خلاف گناہ۔ اگر ہمارے خداوند کی زندگی اور موت کے اس پہلو پر غور کی جائے تو اس سے وہ کراہیت اور ہیبت ثابت ہو سکتی ہے جو مسیح نے اس موقع پر ظاہر کی جب اسکے نیکی کے کاموں کو شیطان سے منسوب کیا گیا۔ تمام انجیلی تواریخ میں رُوح القدس کے خلاف گناہ سب سے زیادہ زور سے مطعون ٹھیرایا گیا۔ یہ کلمات اُن لوگوں کے خلاف استعمال کئے گئے۔ جنہوں نے یہ کہا کہ وہ بدروحوں کے سردار بعل زبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے۔ مسیح

کے جواب سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے کام کو بدی کے کام پر غالب
آنے اور اُس کو تباہ کرنے کے لئے ایسا ضروری اور اظہر من الشمس
سمجھتا تھا کہ فقط نیکی کا کمر بستہ اور سرکش مقابلہ ہی راستی کے خلاف
اس قدر بہتان باندھ سکتا تھا۔ اس نے یہ دکھایا کہ جیسے کام مَیں کرتا
ہوں وہ ہرگز شیطان کے کام ہو نہیں سکتے۔ شیطان اپنے خلاف ایسی
کارروائی کبھی نہ کریگا۔ اس نے اپنے آپ کو ایسا آدمی ٹھیرایا جو زور آور
آدمی کے گھر میں گھُس کر اس کا اسباب لوٹ سکتا ہے۔ آخر الامر اُسنے
اسی قسم کے عبرت آمیز الفاظ زبان سے فرمائے۔ جن کے بعید الفہم اور
ہولناک ہونے کے باعث بنی آدم کا کلیجہ اب تک کانپ رہا ہے (دیکھو
متی ۱۲: ۲۲ الخ و لوقا ۱۱: ۱۴ الخ)۔

(۳۲) **خود ہمارے خداوند کا اپنے کام کی نسبت کیا خیال
تھا**۔ مندرجہ بالا خیالات سے ظاہر ہے کہ ہمارے خداوند کو کیسا کامل
یقین تھا کہ مَیں دنیا میں بدی پر غالب ہونے اور انسان کو اس کے بند
سے خلاصی دینے کی اہم خدمت کے لئے آیا ہوں۔ اور کہ یہ کام میری
قربانی خصوصاً موت کی قربانی سے سرانجام ہوا۔ جن مقامات پر ہم نے
مختصر طور پر غور کی ہے۔ اگر اُن کو مسیح کے تجربوں اور حالات کے ساتھ
لیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ ان میں کفارہ کی ایسی تعلیم پائی جاتی ہے جو
شاید عہد جدید کے دیگر مقامات میں نہ ہوگی۔

(۳۳) **صلیب سے گناہ کی ماہیت ظاہر ہوتی ہے**۔ اکثر
کہا گیا ہے کہ گناہ کی خوفناک ماہیت جیسی صفائی کے ساتھ مسیح کی صلیب
سے ظاہر ہوتی ہے اور کسی چیز سے نہیں ہوتی۔ اور یہ قول نہائت ہی

راست ہے۔ خواہ اس کو تواریخی طور پر خواہ علم الٰہیات کے لحاظ سے مانا
جائے اس کے سچ ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ بت پرستوں کے
نزدیک گناہ بہترین طریق سے منحرف ہو جانا تھا بت پرستوں کے فلاسفر
جہالت کو گناہ کی ماہیت قرار دیتے تھے۔ ان کے خیال میں اگر انسان
کو معلوم ہو جائے کہ کونسی بات بہترین ہے تو وہ اسی کو اختیار کریگا۔
اس خیال سے گناہ ہرگز گناہ نہیں ٹھیرتا۔ یہودیوں کا خیال گناہ کی نسبت
اس سے بڑھ کر تھا۔ کیونکہ شریعت کی تعلیم بغیر اچھی تاثیر کے نہ تھی۔ اکاونواں
مزمور توبہ اور زاری کا ایسا عجیب اظہار ہے کہ اور کہیں پایا نہیں جاتا
اس میں لکھا ہے کہ میں نے تیرے ہی خلاف گناہ کیا ہے۔ اس میں
وہ گہرا خیال موجود ہے۔ کہ گناہ خدا کے خلاف جرم ہے۔ اور یہی اس
کی ماہیت کا روحانی نقشہ ہے۔ مگر عہد عتیق کے دیگر مقامات کی طرح
مسیح کی زندگی اور موت کے بعد یہ مزمور پیشتر کی نسبت وسیع معنوں میں
سمجھا جاتا ہے۔ صلیب نے ہم کو یہ سکھایا ہے کہ گناہ ایک ایسی شئے
ہے جس کو اُٹھا لیجانے کی خاطر ابن اللہ کو قربان ہونا پڑا۔ اس نے
اپنی جان بہتیروں کے لئے فدیہ میں دی۔ ورنہ کبھی چھٹکارا نہ ہو سکتا۔
اس نے گناہوں کی معافی کے لئے اپنا خون بہایا ورنہ گناہونکی معافی
ہرگز نہ ہو سکتی۔ مسیح کے دُکھ اور عذاب سہنے اور صلیب پر چلانے سے یہ
بات نہایت زور سے ثابت ہوتی ہے کہ نجات کی قیمت کیسی بے قیاس
تھی۔ ان تمام باتوں سے انسان نے گناہ کی پلیدگی کا ایسا سبق سیکھا ہے
جو پیشتر کبھی کوئی سیکھ نہ سکا +

ساتواں باب

فارقلیط

(۱) بادشاہت اور مسیح کی زندگی کی طاقت۔ اب ہم آخری مضمون پر غور کرینگے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارا خداوند ایک ایسی بادشاہت کی نبیاد ڈالنے آیا تھا جو ایک بڑی بھاری سوسائٹی ہے وہ محبّت کے اصول پر قائم اور اپنے اصلی صفات میں روحانی ہے۔ اس جماعت کے لئے ضرور تھا کہ خدا کو باپ سمجھے اور اپنے آپ کو بھائیوں اور بہنوں کا ایسا خاندان جانے جس کا سر خدا ہے۔ اس کے شرکا کے لئے ضرور تھا کہ وہ توبہ اور ایمان کے ذریعہ اس نئی زندگی میں داخل ہوں اور اس میں ہوتے ہوئے زندگی اور دل کی راستبازی کو ایسا محسوس کریں جو فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے بڑھ کر تھی۔ ہماری اس دنیا میں اس قسم کا امکان ہرگز قابل یقین نہ ہوتا۔ مگر جس طریق سے ہمارے خداوند نے اپنے تئیں دنیا پر ظاہر کیا۔ اس سے اس کا امکان ثابت ہو گیا۔ اس نے ان سب سے جو اس کی تعلیم کو قبول کرنا چاہتے تھے پوری دلی محبّت طلب کی۔ وہ اس طرح کلام کرتا تھا کہ گویا کہ وہ خدا کے دل سے پورے طور پر واقف ہے۔ جس طور پر وہ خدا کو میرا باپ کہہ کر پکارتا تھا عوام اس سے بھی سمجھتے تھے کہ وہ خدا کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتا ہے۔ وہ نہ فقط انسان سے بڑھ کر اختیار کا دعوے

حقیقت اس انتیار کو عملی طور پر دکھاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے پیروؤں نے معلوم کر لیا کہ وہ طاقت جو بادشاہت کو قائم کرنیوالی ہے وہ ہمارے خداوند ہی میں موجود ہے۔ وہ ابھی آدم ہو کر باپ کے ساتھ ایک تھا۔ خدا ایک نئے اور عجیب طور پر انسانی صورت میں نمودار ہوا +

(۲) بادشاہت اور مسیح کی موت کی طاقت۔ مسیح کی زندگی کی طاقت کی تکمیل اس کی موت کی طاقت سے ہوئی۔ ایک نے بادشاہت کو قائم کیا۔ دوسرے نے بادشاہت کے دشمن عظیم پر فتح حاصل کی۔ اول اول جب ہمارے خداوند نے اپنی موت کی پیشین گوئی کی تو شاگردوں نے اس کی باتوں کو بے معنی معما سمجھا۔ کیونکہ وہ ان کے ادراک سے بعید تھیں۔ بعد ازاں جب وہ موت فی الحقیقت واقع ہو گئی تو انکو اندیشہ تھا کہ وہ سب باتیں خاک میں مل گئیں۔ مگر ہماری خداوند کی اپنی پیشین گوئیاں پوری ہوئیں وہ مر گیا۔ تاکہ وہ زندہ رہے۔ اس نے کھویا تاکہ پائے۔ گیہوں کا دانہ زمین میں گر گیا۔ اور اس کے مرنے سے ایک بڑی بھاری فصل پیدا ہوئی۔ جس وقت بدی اور گناہ غالب ہوتے تھے اسی وقت وہ مغلوب ہوئے۔ اپنی موت سے مسیح نے اپنی اُمت کو چھڑایا اور ان کے لئے زندگی حاصل کی +

(۳) ہمارے خداوند کی اپنی بادشاہت کے زمانۂ آیندہ کے لئے طیاری۔ اس طور مسیح کی زندگی اور موت کے ذریعہ سے بادشاہت معرض وجود میں آئی اور قائم ہوئی۔ مگر اس کا رُخ آیندہ زمانہ کی طرف تھا ہمارے خداوند نے زمین پر ہوتے ہوئے فقط

اس کا شروع ہی کیا تھا۔ یہ صرف رائی کا بیج یا خمیر ہی تھا۔ اس کی ترقی اور پھیلاؤ ہنوز آنے والا تھا۔ یہی اُس کا ارادہ تھا اور اس نے اپنے ایمان لانے والے کو بھی سکھایا کہ نت یہ دُعا مانگیں کہ" تیری بادشاہت آئے"۔ یہ بادشاہت نہ فقط اس خفیف آغاز کی طرف اشارہ کرتی تھی جو اس نے کیا تھا بلکہ اُس جلالی آیندہ زمانہ میں اس تمام خاکہ کی تکمیل ہونے والی تھی۔ یہی وہ مقصد عظیم تھا جس کی خاطر تمام شرکاء کو جدوجہد کرنا اور دُعا مانگنا اور کام کرنا تھا ہم دیکھتے ہیں کہ مسیح نے اپنی خدمت کے اختتام کے قریب بادشاہت کی آیندہ ترقی کے لئے تیاری کی۔ اس کی تعلیم کے پچھلے حصہ میں بعض سب سے بھاری مقامات اسی مضمون کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ اس وقت ہم زیادہ تر انہی پر غور کرینگے اس میں جو امر خاص طور پر توجہ کے لائق ہے وہ رُوح کا وعدہ ہے۔

(۴) اول تین اناجیل میں رُوح کے کام کا بیان۔ اول تین اناجیل میں روح کا کام وہی اعلےٰ منزلت نہیں رکھتا۔ جو یوحنا کی انجیل میں پائی جاتی ہے۔ توبھی ہمارے خداوند کے الفاظ میں اس کی طرف اکثر اشارات پائے جاتے ہیں۔ اسی نے ناصرت کے عبادتخانہ میں عہد عتیق کے ایک نبی کے الفاظ میں یہ دعوےٰ کیا کہ میرا مشن خدا کی روح کی الہام سے ہے (لوقا ۴: ۱۸) جب فریسیوں نے اس کی طاقت کو جو وہ بدروحوں پر رکھتا تھا اُن روحوں کے سردار کی طرف منسوب کیا تو ہمارے خداوند نے ان کو صاف صاف سمجھایا کہ میرا کام خدا کی روح کے ذریعہ سے ہے چنانچہ اس نے فرمایا کہ اگر میں خدا کی روح کی مدد سے بدرُوحوں کو نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہت تمہارے

پاس آپہنچی (متی ۱۲: ۲۰) جو الفاظ روح القدس کے خلاف گناہ کی نسبت
اس آیت کے بعد مندرج ہیں۔ ان سے اس بیان کو حد درجہ کی تقویت
حاصل ہوتی ہے۔ جو تعلّق روح کے کام کا کلیسیا کے آیندہ زمانہ کے
ساتھ ہے وہ بھی انہی اناجیل میں پایا جاتا ہے۔ مسیح نے اپنے شاگردوں
کو آگاہ کیا کہ تم میری خاطر حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے پیش
کئے جاؤ گے۔ اس کی نسبت اس نے ان کو حکم دیا کہ تم اپنے بچاؤ کے
لئے ہرگز فکرمند نہ ہو۔ کیونکہ جو کچھ کہنا ہو گا اسی گھڑی تمہیں بتایا جاویگا
کیونکہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمہارے باپ کی رُوح تم میں بولتی ہے
(متی ۱۰: ۱۹: ۲۰) ایک اَور مقام پر روح القدس کے انعام کا نہائت
صاف وعدہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ پس جب تم بُرے ہو کر
اپنی اولاد کو اچھی چیزیں دینے جانتے ہو تو آسمانی باپ اپنے مانگنے
والوں کو روح القدس ضرور ہی دیگا (لوقا ۱۱: ۱۳) مگر ان اناجیل میں
ایک ایسا مقام ہے جو ان سب سے بڑھ کر ضروری ہے۔ متی کی انجیل
کے اٹھائیسویں باب کی اُنیسویں آیت میں مرقوم ہے کہ جب ہمارا
خداوند اپنے جی اُٹھنے کے بعد اپنے شاگردوں کو الوداعی کلمات فرما
رہا تھا۔ اس نے بعض الفاظ عظیم ایسے استعمال کئے جن میں کلیسیا کے
فرائض کا خاکہ اور انتظام کا طریق پایا جاتا ہے۔ اس نے فرمایا کہ پس
تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ۔ اور انہیں باپ اور بیٹے اور رُوح
القدس کے نام پر بپتسمہ دو۔ ان الفاظ میں اس مسئلہ کا بیج پایا جاتا ہے
جس کو علم الٰہیات کی اصطلاح میں ثالوث کہتے ہیں۔ اس میں علاوہ اس
علم کے مذہب بھی موجود ہے۔ وہ خدا کا اسم اعظم جس میں مسیحی بپتسمہ پاتے

ہیں۔ تینن کا ایک نام ہے۔ اس سے یقیناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہت
کی ترقی میں رُوح القدس کا کام باپ اور بیٹے کے نام کے ساتھ مشتمل ہے۔
(۵) رُوح کی انجیل۔ مگر ہمارے خداوند کی تعلیم کا یہ جزو خصوصاً
چوتھی انجیل میں نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور ہونا بھی
یونہی چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ چوتھی انجیل فی الحقیقت باقی اناجیل کا تتمہ ہے
اور ہمارے خداوند کی شخصیت اور زندگی کا گہرا اور اندرونی نظارہ اس
میں پایا جاتا ہے۔ یہ انجیل ابتدائی مسیحی خیالات کا ایک ایسا نقشہ ہے
جس میں کسی قدر پختہ اور زیادہ تر دھیان اور غور کا پہلو منعکس ہوتا ہے
یہ اس شخص کے قلم کا نتیجہ ہے جو مسیح کے اندرونی خیالات سے سب سے
بڑھ کر واقف تھا۔ اور اسی وجہ سے مسیحیوں کے شبہات کو سب شاگردوں
سے افضل طور پر رفع کر سکتا تھا۔ یوحنّا کی انجیل کو کئی نام دئے گئے
ہیں۔ منجملہ ان کے اس کو روح کی انجیل بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۶) یوحنا کی انجیل کے تیسرے باب کی تعلیم۔ اس انجیل
میں چند ایسے ضروری مقامات پائے جاتے ہیں۔ جن میں ہمارا خداوند
ہر ایک مومن کی روحانی زندگی کو اور بادشاہت کی مسلسل ہستی کو الٰہی
روح کے کام کے ساتھ متعلّق کرتا ہے۔ اسی انجیل میں روح کی علٰحدہ
شخصیت صاف طور پر بیان کی گئی ہے۔ ان مقامات میں جن میں ہر
شخص کی زندگی کا ذکر ہے۔ اول نمبر پر وہ مقام ہے جو (یوحنا ۳: ۵ میں)
میں پایا جاتا ہے۔ یہاں پر روحانی زندگی کا شروع روح کا کام قرار
دیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے جب تک کوئی آدمی پانی اور روح سے
پیدا نہ ہو وہ خدا کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ جو جسم سے پیدا

ہوا ہے جسم ہے اور جو روح سے پیدا ہوا ہے روح ہے۔ بادشاہت کے شرکاء کے لئے ضرور ہے کہ وہ نئی پیدائش حاصل کریں۔ اور روح کے وسیلہ زندہ کئے جائیں ۔

(۷) روح ابحیات ہے۔ چوتھے اور ساتویں ابواب میں ہمارا خداوند اپنے تئیں روح کا سرچشمہ قرار دیتا ہے یعنی جس میں سے روح انسان کی روح میں داخل ہوتی ہے۔ جو کوئی اس پانی میں سے پیئے گا جو میں اُسے دونگا وہ ابد تک پیاسا نہ ہوگا بلکہ جو پانی میں اُسے دونگا۔ اس میں ایک چشمہ بن جائیگا جو ہمیشہ کی زندگی کے لئے جاری رہیگا (یوحنا ۴ : ۱۴) اور ساتویں باب میں خیموں کی عید کے موقع پر یوں لکھا ہے کہ یسوع کھڑا ہوا اور پکار کے کہا اگر کوئی پیاسا ہو تو میرے پاس آکر پیئے۔ جو مجھ پر ایمان لائیگا۔ اس کے بدن سے کتاب مقدس کے بیان کے بموجب زندگی کے پانی کی ندیاں جاری ہونگی۔ اس نے یہ بات اسی روح کی بابت کہی۔ جسے اس پر ایمان لانے والے پانے کو تھے۔ کیونکہ روح اب تک نازل نہ ہوئی تھی۔ اس لئے کہ یسوع اب تک اپنے جلال کو نہ پہنچا تھا (۳۷ سے ۳۹ آیات) یہ مقام اس اول الذکر مقام کی سب سے مشرح تفسیر ہے۔ ان ہر دو مقامات کو یوحنا ۲۰ : ۲۲ کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے ان کا مطلب اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں لکھا ہے کہ یہ کہکر اُس نے اُن کی طرف سانس چھوڑا۔ اور اُن سے کہا کہ رُوح القدس لو ۔

(۸) بالاخانہ کی تقدیر۔ روح کے کام کی نسبت ہمارے خداوند کی تعلیم کا بڑا بھاری حصہ اس بڑی تقریر میں پایا جاتا ہے جو اسنے اپنے

دُکھ اور موت سے پیشتر رات کے وقت فرمائی تھی۔ اور جو یوحنّا کی انجیل کے ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ ابواب میں مندرج ہے۔ اس تقریر کے الفاظ اور مطلب ایک ایسی نصیحت کی صورت میں تھے جو ہمارے خداوند نے اپنے شاگردوں کو کی تاکہ انہیں ان واقعات کے لئے تیار کرے جو جلد سرزد ہونے والے تھے۔ اور نیز ان کو ان کی زندگی اور خدمت کے لئے لائق بنائے۔ جو اس کے دنیا کے کوچ کرنے کے بعد اُن کے پیش آنے والے تھے۔ اسی تقریر اور مسیح کی تعلیم سے جو روح القدس کے کام کی نسبت ہے ہم اس کام کو خاص طور پر کلیسیا کی تواریخ اور مختلف زبانوں میں بادشاہت کی ترقی کے ساتھ متعلّق سمجھتے ہیں۔ اپنے شاگردوں کو یہ کہہ کر کہ میں جدا ہونے والا ہوں اور ان کو تسلی اور دلیری دیکر مسیح نے ایک وعدہ کیا شاگرد اپنی محنتوں اور مشکلات میں تنہا اور بے مدد چھوڑے نہ جائینگے۔ اس نے فرمایا کہ میں باپ سے درخواست کرونگا تو وہ تمہیں دوسرا وکیل (یونانی میں فارقلیط) بخشیگا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے (یوحنا ۱۴: ۱۶) بیٹا اپنی امت سے جدا ہونے والا ہے۔ روح ہمیشہ تک ان کے ساتھ رہیگی۔ مگر حقیقی معنوں میں روح کی موجودگی بیٹے کی موجودگی تھی۔ چنانچہ اُس نے فرمایا کہ میں تمہیں اکیلا نہ چھوڑونگا میں تمہارے پاس آؤنگا (۱۴: ۱۸) +

(۹) روح کے کام کا بیان۔ مندرجہ بالا تقریر میں مسیح بار بار اسی مضمون کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے فرمایا وکیل یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجیگا وہی تمہیں سب باتیں سکھائیگا۔ اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائیگا (۱۴: ۲۶) پھر یہ کہ

وہ میری گواہی دیگی (۱۵: ۲۶) وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھیرائیگا (۱۶: ۸) وہ تم کو تمام حق کی راہ دکھائیگی۔ وہ تمہیں آیندہ کی خبریں دیگی وہ میرا جلال ظاہر کریگی۔ اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کرکے تمہیں خبریں دیگی (۱۶: ۱۳- الخ) نیز روح کا یہ کام مسیح کے کوچ کرنے پر منحصر تھا۔ اس نے فرمایا کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ وکیل تمہارے پاس نہ آئیگا لیکن اگر جاؤنگا تو اُسے تمہارے پاس بھیجدونگا (۱۶: ۱۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روح کی آمد اور خدمت کا خاص مدعا یہ تھا کہ جس کام کو مسیح نے شروع کیا تھا اس کو سرانجام دے۔ روح کا کام یہ تھا کہ وہ مسیح کی بادشاہت کی ترقی کی خاطر مسیح کی اُمت کے لئے باطنی تنویر مکاشفہ اور روحانی طاقت کا منبع ہو +

(۱۰) روح کی شخصیت۔ چوتھی انجیل کے مندرجہ بالا مقامات سے بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہمارا خداوند روح کو باپ سے اور اپنے آپ سے علیحدہ شخص سمجھتا تھا۔ جو ضمیر کا صیغہ اصلی یونانی زبان میں استعمال آیا ہے کہ جس سے کسی خاص شخص کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے گواہی دینا دُنیا کو قائل کرنا ہدایت کرنا مسیح کا جلال ظاہر کرنا وغیرہ۔ پھر وکیل کے لقب سے جو ہمارے خداوند نے روح کو دیا یہی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے صحیح لفظی معنی ہیں۔ وکیل یا کوئی ایسا شخص جو کسی کی حمایت میں کھڑا ہو۔ اس سے زیادہ تر یہ مراد ہے کہ رُوح القدس مسیحیوں کا ان کے خداوند کی عدم موجودگی میں مددگار اور حمائتی ہے۔ وہ دنیا میں مسیح کا جانشین اور مختار رہے۔ اسی خدمت

سے جو روح سے متعلق کی گئی ہے اس کی شخصیت ثابت ہوتی ہے۔ یہ اُن الفاظ کے مطابق ہے جو بپتسمہ کے وقت استعمال کئے جاتے ہیں۔ (دیکھو متی ۲۸: ۱۹) اور معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خداوند کے خیال میں بھی الٰہی ذات کے اُس مسئلہ کی نسبت جس کو کلیسیا ثالوث کا مسئلہ کہتی ہے یہی امتیاز موجود تھا +

(۱۱) باپ اور بیٹے کیساتھ روح کا تعلق۔ جو نتیجہ اس آخری فقرہ میں پیش کیا گیا۔ وہ اس طریق سے جس میں روح کا باپ اور بیٹے کے ساتھ دیگر مقامات میں بیان کیا گیا ہے اور بھی تقویت پاتا ہے۔ اس کی آمد خود مسیح کی آمد ہے (دیکھو یوحنا ۱۴: ۱۸) وہ باپ سے نکلتی ہے اور بیٹا اس کو بھیجتا ہے (یوحنا ۱۵: ۲۶) وہ اپنی طرف سے نہ کہیگی۔ لیکن جو کچھ سُنے گی وہی کہیگی (یوحنا ۱۳: ۱۶) وہ میرا جلال ظاہر کریگی۔ اسی لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دیگی۔ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتی ہے اور تمہیں خبریں دیگی (۱۶: ۱۵) یہ الفاظ عجیب طور پر اس طریق سے مطابقت رکھتے ہیں جس پر ابتدائی تقریروں میں باپ اور بیٹے کا تعلق بیان کیا گیا ہے۔ ہمارا خداوند فرماتا ہے کہ جس نے مجھے بھیجا وہ سچا ہے۔ اور جو میں نے اس سے سنا ہے وہی دنیا سے کہتا ہوں (۸: ۲۶) اور پھر کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا بلکہ جس طرح باپ نے مجھے سکھایا ہے۔ اسی طرح باتیں کہتا ہوں (آیت ۲۸) پھر یہ کہ میں نے جو اپنے باپ کے ہاں دیکھا ہے وہ کہتا ہوں (آیت ۳۸) ان تمام الفاظ کا حاصل کلام اسی فقرہ میں ہے کہ مَیں اور باپ ایک ہیں (۱۰: ۳۰) جو تعلیم روح کی نسبت ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں

کہ باپ اور بیٹے کے اتحاد میں روح بھی شامل ہے اور ان سب کو ملا کر قاطع طور پر ثابت ہوتا ہے کہ باپ اور بیٹے اور روح القدس کے اسم اعظم کا مطلب مسیحی جماعت نے صحیح طور پر سمجھا ہے ؎

(۱۲) روح مسیح کے کام کو سر انجام دیتی ہے۔ ہم نے بھی بیان کیا ہے کہ ہمارے خداوند کی تعلیم روح کی منزلت کی نسبت کیا ہے اب ہم روح کے کام کی ماہیت پر غور کرینگے بادشاہت کے متعلق اس کا اول کام یہ ہے کہ مسیح کی جانشین ہو۔ مسیح کے چلے جانے کے بعد اس کا کام یہ ہے کہ وہ اس کے شاگردوں کو تعلیم دے ان کی ہدایت کرے اور انکو منور کرے۔ اس کی حضوری مسیح کی حضوری ہے۔ جو کام مسیح نے شروع کیا وہ اس کو سرانجام دینے والی ہے۔ اس کا آنا اس کام کی تکمیل کے لئے فی الحقیقت ایسا ضروری ہے کہ ہمارے خداوند نے فرمایا کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ وکیل تمہارے پاس نہ آئیگا لیکن اگر جاؤنگا تو اُسے تمہارے پاس بھیج دونگا (۱۶: ۷) ؎

(۱۳) روح کی تعلیمی خدمت۔ جو تعلیم کا کام مسیح نے شروع کیا روح نے اس کو قائم رکھنا تھا۔ مسیح نے فرمایا کہ وہی تمہیں باتیں سکھائیگا (یوحنا ۱۴: ۲۶) انجیلی تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد اپنے اُستاد کی تعلیم کو کما حقہ سمجھنے میں قاصر تھے۔ خصوصاً بادشاہت کی نسبت ان دنیاوی خیالات کو جو یہودیوں کے درمیان درج تھے۔ اپنے دلوں سے خارج کرنا از بس دشوار تھا۔ بلکہ جب ہمارے خداوند نے اپنے اور اُس نئے انتظام کی نسبت جو وہ قائم کرنے کو تھا نہایت صاف صاف الفاظ فرمائے تو وہ اس کے مطلب کو گرفت نہ کر سکے۔ اس لئے ضرور تھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد شاگردوں کی تعلیم کا سلسلہ

قائم رہے۔ اسی وجہ سے وہ روح کی نسبت فرماتا ہے کہ وہی تمہیں سب باتیں سکھائیگا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائیگا (۱۴: ۲۶) جو کچھ اُنہوں نے مسیح سے سیکھا تھا وہ اُنہیں از سرِ نو حاصل کرنا ضرور تھا اور یہی رُوح کی تاثیر سے انہیں سرانجام دینا تھا۔ پھر اس امر کی بھی ضرورت تھی کہ وہ آئندہ کے لئے اور اُس خدمت عظیم کے لئے جس کے لئے وہ مقرر کئے گئے تیار کئے جائیں۔ اسی خیال سے ہمارا خداوند فرماتا ہے کہ روح تم کو تمام حق کی راہ دکھائیگی اور تمہیں آیندہ کی خبریں دیگی۔ (۱۶: ۱۳) اس بھاری نئے انتظام میں جو ان کے ذریعہ قائم ہونے کو تھا۔ رُوح القدس ان کی تمام مشکلات میں ان کی مدد کے لئے درکار تھی ✤

(۱۴) مسیح کی گواہی کا کام۔ علاوہ ازیں روح کی طرف ہمارے خداوند کے متعلق ایک خاص فعل منسوب کیا گیا ہے۔ مسیح نے فرمایا کہ وہ میری گواہی دیگی (۱۵: ۲۶) وہ میرا جلال ظاہر کریگی۔ اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دیگی۔ ہمارے خداوند کی تعلیم میں شروع سے آخر تک انسانی روح کی اپنے ساتھ تعلق کی ضرورت پر از حد زور دیا گیا ہے۔ وہ اعلیٰ ترین عبادت اور انسانی دل کی محبت اور ایمان کو طلب کرتا ہے۔ خداوند کے ساتھ اسی تعلق کے ذریعہ سے انسان نجات پاتا ہے۔ مگر خداوند کی غیر حاضری میں انسان یہ تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب مندرجہ بالا حوالہ میں دیا گیا ہے۔ الٰہی حکمت نے اس بات کا خاص انتظام کر دیا ہے۔ یہ روح القدس کا کام ہے کہ دنیا میں مسیح کی قائم مقام ہو۔ اس کی گواہی دے اس کا جلال ظاہر کرے اور اس کی باتیں بنی آدم پر روشن کرے ✤

(۱۵) روح اور دنیا۔ روح کا ایک کام دنیا کے متعلق بھی ہے۔

لکھا ہے کہ وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھیرائیگا۔ گناہ کے بارے میں اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راستبازی کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھوگے۔ عدالت کے بارے میں اس لئے کہ اس دنیا کا سردار مجرم ٹھیرایا گیا ہے (۱۶: ۸ الخ) اس سے ظاہر ہے کہ روح کا کام اس بھاری خدمت کے لئے جو ہمارے خداوند نے اپنے شاگردوں کے سپرد کی ضروری تھا۔ جو کچھ اُنھوں نے سُنا اور تجربہ کیا تھا اس کے اندرونی معنوں کو سیکھنا ابتک باقی تھا۔ ان کو اپنے خداوند کی شخصیت اور خدمت کی نسبت گہرے اور حقیقی خیالات کو حاصل کرنا تھا۔ ان کے لئے ضرور تھا کہ اپنی خدمت کی ماہیت اور اس کے مدعا کی نسبت صحیح قیاس دل میں جمائیں۔ پھر ان کا سابقہ دنیا کے ساتھ پڑنا تھا۔ محض انسانی علم اور طاقت اس اہم کام کو سرانجام نہ دے سکتی تھی۔ چند شاگردوں کا ایک گروہ کیونکر دنیا کے خیالات کو پلٹ سکتا تھا اور گناہ اور راستبازی اور عدالت کی نسبت بنی آدم کو قایل کرسکتا تھا۔ ایسی خدمت کے لئے کوئی طاقت انسانوں سے بڑھ در کار تھی۔ اسی وجہ سے شاگردوں کے ساتھ روح کی آمد کا وعدہ کیا گیا تھا +

(۱۶) ہمارے خداوند کا وعدہ کیونکر پورا ہوا۔ اس وعدہ کا ایفا رسولوں کے اعمال کی کتاب اور خطوط حواریان سے معلوم ہوتا ہے اور یقیناً جو طاقت اور بصیرت اور سرگرمی پنتیکوست کے روز عظیم کے بعد رسولوں اور ان کے رفیقوں کی زندگی اور اعمال میں پائی گئی وہ نہایت حیرت افزا ہے جو آدمی پیشتر شکی ودولے اور ڈرپوک تھے وہ دلیر اور مستعد اور مستقل مزاج ہوگئے۔ اُن کے قلب جو اپنے خداوند کی روحانی تعلیم کی نسبت بے بصر

معلوم ہوتے تھے دفعتہً منور ہو گئے۔ ان کے ارادہ نے کمر ہمت باندھ لی۔ یسوع مسیح اپنی غیر حاضری میں ایسی صفائی سے نظر آنے لگا کہ اپنی موجودگی میں نہ آیا تھا۔ جو وعدہ اعمال کی کتاب کے پہلے باب کی آٹھویں آیت میں مندرج ہے یعنی یہ کہ جب روح القدس تم پر نازل ہو گا تو تم قوت پاؤ گے اور تم میرے گواہ ہو گے وہ حرف بحرف پورا ہوا۔ ان باتوں سے ایک ہی صحیح نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے خداوند کے جی اُٹھنے اور روح القدس کے دئے جانے کا جو بیان عہد جدید میں پایا جاتا ہے وہ لفظ بلفظ صحیح ہے ؂

(۱۷) روح کے وعدہ کی نسبت لوقا کی گواہی۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ لوقا اعمال کی کتاب کے شروع میں کیونکر روح کے وعدہ کی نسبت یوحنا کے بیان کی تصدیق کرتا ہے (اعمال ۱: ۴) سے معلوم ہوتا ہے مسیح نے اپنے جی اُٹھنے کے بعد اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ یروشلیم سے باہر نہ جاؤ۔ بلکہ باپ کے اس وعدہ کے پورا ہونیکے منتظر رہو جس کا ذکر تم مجھ سے سُن چکے ہو۔ اسی وعدہ کی طرف لوقا کی اپنی انجیل میں اشارہ کیا گیا ہے (۲۴: ۴۹) مگر اس کا بیان یوحنا کے چودھویں و پندرھویں و سولھویں ابواب میں مندرج ہے۔ اور اس کی تصدیق اس سے بہت بڑھ کر آگے پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اعمال کی کتاب میں جو تواریخی حالات مذکور ہیں۔ وہ ایسی صورت میں بخوبی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ جب ہمارے خداوند کے اُن اصولوں کو جو یوحنا کی انجیل میں پائے جاتے ہیں مدنظر رکھا جائے ؂

(۱۸) روح تواریخی سلسلہ ہدایت کرتی ہے۔ روح القدس کا کام بادشاہت کو پھیلانے اور ترقی دینے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اُسکے ذریعہ باپ اور بیٹا اس بڑے روحانی اور اخلاقی انتظام میں ملکر کام کرتے ہیں

جس کے وسیلہ بدی بتدریج مغلوب ہوتی اور نیکی انسان کی زندگی اور دل
میں قائم ہو جاتی ہے۔ اسی کے ذریعہ سوسائٹی کا انتظام برقرار رہتا ہے۔
وہ ہر ایک فرد بشر اور ہر ایک جماعت میں نو پیدایش کا وسیلہ ہے۔ وہی
انسانی خیالات کی تحریک پر قادر ہے۔ وہ تمام سچائی کی طرف ہدایت کرتی
ہے۔ خیالات کی حرکت کا سلسلہ صحیح مقاصد پر منحصر ہے یہی مقاصد اعلےٰ ترین
ہدف بن جاتے ہیں۔ ان میں خاص الخاص وہ ہدف ہے جو بادشاہت کے
متعلق ہے۔ اس معراج تک پہنچنے کے لئے باپ کی محبت بیٹے کے تسلّط کے
ماتحت دل کی متابعت اور روح القدس کی جز گیراں تاثیر درکار ہے۔ اس تاثیر
کے ذریعہ انسان کے مقاصد اعلےٰ ترین ہدف کے زیر تسلّط ہونے چاہیئے۔ تاکہ
آخرکار بادشاہت اپنی کاملیت میں ظاہر ہو *

آٹھواں باب

مسیح کی معموری

(۱) خلاصہ۔ ہم اپنے خداوند کی تعلیم کے خاص مضامین پر مختصر اً
نظر دوڑا چکے ہیں۔ اب ہمیں چند فقرات میں اس بحث کی موٹی موٹی باتوں کا
خلاصہ پیش کرنا ہے۔ ہم خصوصاً اخلاقی اور مذہبی خیالات کو ملانے کی کوشش
کرینگے تاکہ ظاہر ہو جائے کہ وہ کیونکر ایک دوسرے کی تکمیل کے لئے ضروری
ہیں *

(۲) بادشاہت۔ اخلاقی تعلیم کے حصہ میں بادشاہت کا خیال اول

درجہ رکھتا ہے۔ یہ فی الحقیقت وہ معراج ہے جو روحوں کے عالم کو محبّت کے بندسے قائم اور مضبوط رکھتا ہے۔ اس میں اعلےٰ ترین برکت ایک مشترک برکت ہے جس میں سب مل کر اور ہر ایک فرد بشر حصہ دار ہے۔ جہاں کہیں دنیا میں محبّت کا اصول موجود ہے۔ وہیں اس بادشاہت کا وجود بھی پایا جاتا ہے۔ مگر دنیا میں اس کی حالت ناکامل رہتی ہے۔ اس کی کامل حالت وہی اعلےٰ ترین معراج ہے۔ جس تک پہنچنے کی انسانی چال وچلن کو کوشش کرنی چاہیئے۔ جس کی خاطر سب کام اور دعا کو کرنا ضرور ہے اور جس کی تکمیل میں اس کے تمام شرکاء کی ابدی سیری ہے ۔

(۳) بادشاہت کے شرکاء۔ جو لوگ اس بادشاہت میں داخل ہونا چاہیں ان کو چھوٹے بچّوں کی طرح شروع کرنا چاہیئے۔ ضرور ہے کہ وہ اپنی ضرورت اور روحانی ناداری کو محسوس کریں تو یہ کریں یعنی بُری اور دُنیاوی زندگی کو ترک کر کے روحانی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تب وہ صاف دل اور خلوص باطن حاصل کرینگے۔ اور یہی صفت ان لوگوں کے لئے لازمی ہے جو سیرت کے اعلےٰ ترین نمونہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ سیرت خواب عظیم کی سیرت کا نقشہ ہے۔ خدا کی سیرت جس کا اصلی خاصہ محبّت ہے۔ اعلےٰ ترین سیرت کا معراج ہے۔ غرض چال وچلن اور سیرت ہر دو پہلوؤں پر ہمارے خداوند کی اخلاقی تعلیم جیسا کہ بار بار بیان ہو چکا ہے۔ نفی نہیں بلکہ اثباتی ہے۔ چال وچلن کے پہلو پر بادشاہت کی تلاش کرو۔ ایک عملی اصول ہے۔ سیرت کے لحاظ سے محبت کی صفت کی سرفرازی اخلاقی زندگی کی روح و روان ہے ۔

(۴) بادشاہت کی بڑھتی۔ بادشاہت نہ فقط ہر فرد کی زندگی اور

دل میں بلکہ تمام بنی آدم کی زندگی میں بڑھتی جاتی ہے ۔ اسی موخرالذکر اخلاقی ترقی کے لحاظ سے ہمارے خداوند نے کئی ایک تمثیلیں فرمائیں جن سے ہم سیکھتے ہیں کہ بادشاہت دنیا میں ایک بڑا بھاری از سرِ نو زندگی بخشنے والا اصول ہے۔ وہ خمیر کی مانند پھیلتا جائیگا جب تک کہ سب خمیرانہ ہو جائے۔ یہاں پر ہمارے خداوند کی تعلیم میں دنیا کے ملکی اور دینی انتظام بھی شامل ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آخر کار سب بادشاہت کی آمد میں مددگار ثابت ہونگے۔ تعلیم کا یہ حصہ جو نہایت عجیب اور پیشینگوئی کی صفت کو لئے ہوئے ہے اگر اس کے ساتھ مسیحیت کی ابتدائی صدیوں کی تواریخ ملا کر پڑھا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خداوند نے اپنے اخلاقی نگاہ کے حلقہ میں سے حاکمانِ وقت کی نسبت فرائض کو نظرانداز نہیں کیا جیسے کہ عموماً کوتاہ بین نکتہ چین لوگ کہا کرتے ہیں +

(۵) بادشاہت کا آخری ظہور۔ آخرالامر مسیح نے اعلےٰ ترین تصور کو بڑے آخری ظہور کو ہمیشہ مدنظر رکھا۔ وہ موجودہ زندگی کو ہمیشہ آیندہ زمانہ کی روشنی کے مقابلہ میں دیکھتا تھا۔ اور اپنے سامعین کے دلوں پر بڑے زور سے یہ نقش کرتا تھا کہ تمہیں اس انجام عظیم کو مدّنظر رکھ کر زندگی بسر کرنا اور کام کرنا چاہیئے۔ وہ جانتا تھا کہ اس طور پر کام کرنے والا محض دنیاوی خیال سے بلند بر تر ہو کر اعلےٰ اور مقدّس زندگی کے اصول کو مدّنظر رکھیگا۔ اس نے اپنی اُمت کو اس طور پر دُعا مانگنا سکھایا کہ تیری بادشاہت آوے +

(۶) اخلاق کا دارومدار مذہب پر ہے۔ انسانی زندگی

کے مقصد کا عجیب بیان جس کا مختصر ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں ایک ہوائی قلعہ اور خیالِ خام ہوتا اگر اس کی بنیاد بعض بڑے مذہبی خیالات پر قائم نہ ہوتی۔ ہم نے ان خیالات پر کسی قدر غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ بطور خلاصہ کے یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ اخلاقی خیالات خدا کی نسبت مکاشفہ عظیم سے طاقت حاصل کر کے عمل میں آ سکتے ہیں ٭

(۷) خدا کی ابویّت۔ اس الہام کے اصولوں میں سے اول درجہ پر خدا کی ابویت ہے۔ بادشاہت کی بنیاد خدا کی ذات میں ہے۔ خدا محبت ہے اور یہی بادشاہت کی ہستی کا ثبوت ہے یہ اصول وہ پتّھر کی بنیاد ہے جس پر مسیحی الہام کا ہر ایک حصہ قائم ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو آخر کار اسی صداقت تک گھری نہیں جاتی۔ بادشاہت مسیح اُس کا کام اس کی زندگی اور موت اور قیامت روح کے کام یہ سب باپ کی محبّت پر قائم ہیں۔ اور خدا کی ابویت کا سب سے کامل مکاشفہ مسیح کے اندرونی احساس سے پایا جاتا ہے ٭

(۸) بدی۔ بعض باتیں بادشاہت کی آمد کے رستہ میں ایسی حایل ہیں جن پر حاوی ہونا بظاہر محال ہے۔ مثلاً انسانی روح کی بے بصری اور اُس کے دل کی سختی۔ پھر ایسی خود غرضی جس سے ہر ایک شخص کسی الٰہی نعمت کے پیچھے جد و جہد میں ہے جس کو وہ بلا لحاظ اپنے ہمسایہ کے حاصل کرنے اور رکھنے کا دعوے کرتا ہے۔ پھر گناہ اپنے تمام صورتوں میں ایسا زبردست ہے کہ انسانی بگڑی ہوئی سرشت پر اپنا قابو رکھتا ہے اور دنیا میں انسان کی سوشل زندگی پر اسکو گرفت حاصل ہے۔ غرض دنیا میں بدی کی طاقت موجود ہے جو نیکی کے

مقابل تلی بیٹھی ہے +

(۹) مسیح کے ذریعہ فتح۔ خود ہمارا خداوند ان مشکلات پر غالب آنے کا ذریعہ ہے۔ وہ خود خدا کا مکاشفہ ہے۔ وہ اس دُنیا کی تاریکی میں خدا کا جلال ہو کر چمکتا ہے تاکہ گنہگار انسان کی کمزور آنکھیں اس کو دیکھ سکیں۔ وہ خدا کی محبت ہے جو ایسے طور پر پیش کی گئی ہے کہ سخت دل بھی اس سے تاثیر پذیر ہو سکتے ہیں۔ مجسّم خدا ہو کر وہ خدا اور انسان کے درمیان اتحاد کا ذریعہ ہے خواہ وہ انسان کسی قوم یا حالت کے لوگ کیوں نہ ہوں۔ اپنی زندگی اور قیامت سے اس نے موت پر فتح پائی ہے بنی آدم کو خلاصی بخشی اور گناہوں کی معافی اور خدا کے ساتھ میل کو ممکن ٹھہرایا۔ اپنی محبّت کی طاقت سے اُس نے بنی آدم کو وہ اخلاقی طاقت بخشی ہے جو پیشتر کبھی میسّر نہ ہو سکتی تھی۔ الٰہی محبّت اور رحم کا بڑا مکاشفہ یسوع مسیح کو انسان کے دل پر حاکم ہونے کا اعلےٰ حقدار ٹھیرایا ہے۔ اور اس حق کو اُس نے ایسے زور سے پیش کیا کہ جس میں غلطی کا امکان ہو نہیں سکتا اور وہ اس دعوے پر کیوں اتنا زور دیتا ہے اسی وجہ سے کہ اس پر ایمان لانے سے اور اس کے دعوے کو مان لینے سے بادشاہت انسان کے دل اور زندگی میں آجاتی ہے +

(۱۰) روح۔ مگر یسوع مسیح تو دنیا سے کوچ کر گیا اس حالت میں انسان اس پر کیونکر توکل رکھ سکتا ہے جب کہ خود خداوند میدان جنگ میں موجود نہیں تو اس کی فوج بدی پر کیونکر غالب ہو سکتی ہے مگر گو وہ نظر نہیں آتا تو بھی اپنے اعلےٰ جانشین روح القدس کے ذریعہ سے

یہاں موجود ہے۔ انسانی خیالات اور کوششوں پر الٰہی نگرانی پائی جاتی ہے۔ خدا کی روح دنیا میں کام کر رہی ہے۔ بدی کا مقابلہ کر کے اس پر غالب آتی ہے۔ جو لوگ اس کی ہدایت کو طلب کرتے ہیں۔ اس کی ہادی ہے۔ اخلاقی غلبہ کی طاقت دیتی ہے۔ اس دنیا کے کاروبار پر اختیار رکھتی ہے اور ابدی محبّت کی بادشاہت کو لاتی ہے +

غلام قادر مسیحی پرنٹر کی معرفت
رفاہِ عام سٹیم پریس لاہور میں چھپی

عشائے ربانی کا بیان (پادری ڈاکٹر ہوپر صاحب)	۱۰/
ہدایت الاستقامت مجلّد	۲/
بلا جلد	۱/
عشائے ربانی کی تیاری کی عبادت	-/
" " " رومن	۰/
عشائے ربانی کی ہدایات	-/
امداد العبادت	۸/
" رومن	عہ

سوال وجواب

دینی سوال وجواب	-/
کیٹے کیومن (یعنی اقراری کو داخل کرنے کی ترتیب)	-/
مسیحی دین کی اصولی باتیں (بشپ مول صاحب کی کتاب کا ترجمہ)	۶/
استحکام	ـــ/

گیت و بھجن

مسیحی گیت کی کتاب	۱۲/
" " رومن	۱۰/

متفرق

حین الحیات (روح القدس کے بیان میں)	۸/
تحفۃ النساء (مسیحی مستورات کے بیان میں)	۶/

المشتہر۔ سکرٹری ریلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور